MUD-008

کلاسیکی اردو شاعری

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

3

اُردو مثنوی

بلاک 3 کا تعارف

اکائی 9

مثنوی کی تعریف، اجزاے ترکیبی اور فنی خصوصیات 147

اکائی 10

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ) 161

اکائی 11

دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا 175

اکائی 12

شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا 189

بلاک 3 تعارف

بلاک3

اکائی 9 مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات

9.3.1 مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

9.3.2 مثنوی کے اجزائے ترکیبی

9.3.3 مثنوی کی فنی خصوصیات

9.3.4 حاصل مطالعہ

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

9.6 سوالوں کے جوابات

9.7 فرہنگ

9.8 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف سے متعارف ہوں گے۔
- مثنوی کے اجزائے ترکیبی سے واقف ہوں گے۔
- مثنوی کے فن سے بحث کریں گے۔
- مثنوی کے فن کی خصوصیات وامتیازات کو سمجھیں گے۔
- مثنوی کے فن کی انفرادیت اور اہمیت کو جانیں گے۔

9.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ بلاک کی اکائیوں میں آپ اردو کے نمائندہ قصیدہ گو شعرا مرزا محمد رفیع سودا، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرزا غالب، محسن کاکوروی اور ان کی قصیدہ نگاری سے واقف ہوئے۔ آپ نے مذکورہ شعرا کے نمائندہ قصائد کے منتخب متن کا بھی مطالعہ کیا جس کے ذریعے آپ ان کی قصیدہ نگاری کی فنی خصوصیات و امتیازات اور اردو قصیدہ نگاری میں ان کے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہوئے۔ صنفِ قصیدہ کی طرح صنفِ مثنوی بھی کلاسیکی شاعری کی نمائندہ صنف ہے۔ اب تیسرے بلاک کی اس پہلی کائی میں آپ صنفِ مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف، اس کے اجزائے ترکیبی سے واقف ہوں گے اور اس کی فنی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

9.3 مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات

9.3.1 مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

مثنوی عربی لفظ ہے۔ اس کا مادہ ث ن ی ہے۔ مثنوی کا لفظ عربی کے لفظ 'مثنیٰ' سے بنایا گیا ہے۔ مشہور عربی لغت 'المعجم الوسیط' میں اس لفظ سے متعلق اس طرح لکھا گیا ہے:

''المثنوی من الشعر ما کان فیہ کل شطرین بقافیۃ واحدۃ''

(المعجم الوسیط: مرتبین: ابراہیم مصطفیٰ، احمد حسن وغیرہم، المکتبہ الاسلامیہ، ترکی، ۱۹۷۲ء، جلد اول، ص: ۱۰۲)

یعنی وہ شعر جس کے دونوں مصرعے ایک قافیہ میں ہوں۔ 'فرہنگ آصفیہ' میں مثنوی اسم مؤنث منسوب بہ 'مثنیٰ' ہے جس کے معنی 'دو' کے ہیں۔ اصطلاح میں مثنوی اس شعری صنف اور مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر دوسرے شعر میں قافیہ بدل جائے لیکن پوری مثنوی میں ایک ہی بحر کی پابندی کی گئی ہو۔ مثنوی کے لیے ہزج، رمل، سریع، خفیف، متقارب اور متدارک وغیرہ میں سے کوئی بھی ایک بحر استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک بیانیہ صنفِ شاعری ہے جس میں عموماً طویل واقعات اور لمبے لمبے قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ مثنوی کے تعلق سے حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری لکھتے ہیں:

> ''لغت میں مثنوی منسوب ہے مثنیٰ کی طرف اور مثنیٰ میم مفتوح و سکون ثائے مثلثہ و الف مقصورہ سے دو کے معنی میں ہے۔ جب یائے نسبت اس کے آخر میں لگائی گئی تو الف مقصورہ واو سے بدل گیا اور اصطلاح میں ان اشعار کو مثنوی کہتے ہیں جن میں دو دو مصرع باہم مقفیٰ ہوں۔۔۔ مثنوی کے دیباچے میں توحید و مناجات اور مدح حاکم وقت و

تعریف سخن وعشق وغیرہ وسبب تالیف وتصنیف کا ہونا مولانا نظامی گنجوی کی ایجاد ہے"۔

(حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری (مؤلف)، بحر الفصاحت، راجہ رام کمار بک ڈپو، وارث نول کشور بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء، ص: ۱۰۵)

مثنوی اس طویل نظم کا نام ہے جس میں کوئی قصہ یا واقعہ ربط وتسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے، خیال مربوط ہو، بات سے بات نکلے اور قصہ بتدریج آگے بڑھے۔ اس میں لمبی سے لمبی بات کو تفصیل سے بیان کرنے اور ہر طرح کا مضمون ادا کرنے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ اس طرح مثنوی ایک ایسی شعری صنف کی حیثیت سے سامنے آتی ہے جو ایک طویل، مربوط اور مکمل شعری کارنامہ وجود میں لانے کے امکانات رکھتی ہے۔ اس لیے مولانا حالؔی کا کہنا ہے کہ اردو شاعری کی جتنی بھی اصناف ہیں، ان میں سب سے کارآمد صنف مثنوی ہی ہے۔ اس میں داخلی اور خارجی اعتبار سے بلند پایہ شاعری کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ غزل کا شعر کم وقت میں بھی کہا جاسکتا ہے مگر مثنوی کہنے کے لیے مثنوی نگار کو کئی چیزوں کو پیش نگاہ رکھنا ہوتا ہے۔ مثلاً قلم اٹھانے سے پہلے ذہن میں مثنوی کا خاکہ مرتب کرنا، مستقل مزاجی کے ساتھ اسے تکمیل کو پہنچانا، واقعات کی ترتیب وتعمیر ایسی کرنا کہ قصہ مربوط رہے اور زبان ایسی استعمال کرنا جو پڑھنے والے کے لیے پیچیدگی اور الجھاؤ کا باعث نہ بنے بلکہ واقعات پر اس کی توجہ اور دلچسپی کو برقرار رکھے وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ اگر مثنوی میں کچھ ایسے اشعار پائے جائیں جس کی دل کشی قاری کو اپنی جانب کھینچ لے تو اسے مثنوی کا عیب تصور کرنا چاہیے۔ مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں رزم و بزم، اخلاق وفلسفہ اور عشقیہ قصے غرض ہر طرح کے موضوعات منظوم انداز میں بیان کیے جاتے ہیں۔ مثنوی میں غزل کی طرح رمزیاتی وکنایاتی انداز بیان نہیں اپنایا جاتا بلکہ توضیحی انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے اور واقعات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے تاکہ واقعات قاری کو آسانی کے ساتھ ذہن نشیں ہوجائیں۔ مثنوی میں چوں کہ ہر شعر کا قافیہ بقیہ اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے اور ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، اس لیے اسے مثنوی کہا جاتا ہے یعنی دو ہم قافیہ مصرعے۔ مثلاً:

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ

بہت حشمت و جاہ و مال و منال
بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال

کئی بادشاہ اس کو دیتے تھے باج
خطا و ختن سے وہ لیتا خراج

ان اشعار میں بادشاہ، پناہ، منال، حال، باج اور خراج قافیہ ہیں جو ہر شعر میں جدا جدا ہیں۔ یہی

صورت مطلع کی بھی ہوتی ہے۔اس لیے مثنوی کومطلعوں کا مجموعہ بھی کہتے ہیں۔

9.3.2 مثنوی کے اجزاے ترکیبی

مثنوی بیانیہ صنفِ شاعری ہے۔اس میں مربوط و مسلسل انداز میں کسی قصہ یا واقعہ کا بیان ہوتا ہے۔اس قصہ یا واقعہ کوآگے بڑھانے کے لیے کرداروں کووضع کیا جاتا ہے۔قصے یاواقعات کوربط وتسلسل کے ساتھ بیان کرنے کا نام پلاٹ ہے۔ایک مضبوط پلاٹ اچھی مثنوی کا ضامن ہوتا ہے۔مثنوی میں کرداروں کے جذبات بھی بیان ہوتے ہیں اورتہذیب ومعاشرت کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔اس لیے مثنوی میں زبان اوراندازِ بیان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پلاٹ، کردارنگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظرنگاری اور اسلوب بیان، یہ سب مثنوی کے اجزاے ترکیبی کہلاتے ہیں۔قدیم مثنویوں میں داستان کی طرح مافوق الفطری قصے،عشق ومحبت کی داستانیں، جنگ اورمہم جوئی کے واقعات قلم بند کیے جاتے تھے۔کچھ مثنویاں نصیحت آموز واقعات سے پُر ہوتی تھیں۔اس لیے قدیم مثنویوں میں آٹھ،نواجزاے ترکیبی ہوا کرتے تھے۔اس تعلق سے ڈاکٹر گیان چندجین رقم طراز ہیں:

> ''قدیم رنگ کی مثنوی میں کئی جز ہوتے ہیں۔لیکن اس کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں کی جاتی بلکہ شاعرحسب مرضی ان میں ترمیم کرلیتا ہے۔نظم کی ابتداحمداورنعت سے ہوتی ہے۔شیعہ حضرات منقبت حضرت علی اور مدح ائمہ بھی لکھتے ہیں۔ مذہبی بزرگوں کی مدح وتوصیف کے بعد شاعر کے مربی کی مبالغہ آمیزتعریف ہوتی ہے۔ یہ مربی بادشاہ،نواب، وزیر سے لے کرکوئی معمولی رئیس تک ہوسکتا ہے۔بعض شعرا تعریف سخن یاتعریف خامہ یامناجات عاشقانہ بھی تحریر کردیتے ہیں لیکن یہ نہایت شاذ ہے۔ مدحت طرازی کے بعد تالیف یا وجہ تصنیف کا جزو ہوتا ہے۔اس سے مصنف اورمثنوی کے ماخذ کے متعلق بیش بہامعلومات حاصل ہوتی ہیں۔اس تمہید کے بعداصل داستان شروع ہوتی ہے۔بعض شعرااس مقام پرساقی نامہ لکھ دیتے ہیں۔..... مثنوی کے اخیر میں چنداشعار کا خاتمہ ہوتاہےجس میں شاعراپنی عرق ریزی کی داد چاہتا ہے یا خودہی اپنی تعریف کر کے جی بہلا لیتا ہے، یابارگاہ ایزدی میں اس دماغی ہفت خواں کے انجام ہونے پرتشکر پیش کرتا ہے یا پھروہی آفاقی دل خوش کن تمنا کہ جس طرح اشخاص مثنوی کے دن پھرے ہیں ہمارے تمہارے بھی دن پھریں''۔
>
> (ڈاکٹر گیان چندجین، اردومثنوی شمالی ہند میں، جلداول، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی،۱۹۸۷ء،ص:۵۹،۶۰)

ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق قدیم رنگ کی مثنوی کے اجزاے ترکیبی اس طرح ہیں:

۱۔حمد

۲۔نعت

۳۔منقبت حضرت علی اور مدح ائمہ

۴۔مربی کی تعریف

۵۔تعریف سخن یا تعریف خامہ یا مناجات عاشقانہ

۶۔سبب تالیف یا وجہ تصنیف

۷۔ساقی نامہ

۸۔اصل قصہ یا داستان

۹۔خاتمہ، اس مقام پر شاعر داد سخن چاہتا ہے یا بذات خود اپنی تعریف کرتا ہے۔

قدیم منثویاں بہت حد تک ان اجزا کی پابند تھیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام مثنویوں میں اس کی پابندی کی گئی ہو۔ جدید منثویوں کا رنگ جداگانہ ہے کیوں کہ جدید مثنویوں کا انحصار صرف قصہ گوئی پہ نہ رہ کر معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی مسائل کی عکاسی پر بھی ہے۔ جدید مثنویوں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں قدیم رنگ کے ساتھ بلند آہنگی، دلی جذبات، ملکی رسمیں، خوشی وغم کی نمائندگی اور مذہبی وملی عقیدت، یہ تمام چیزیں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ قدیم وجدید کی بحث سے قطع نظر، مثنوی کے نمایاں اجزاے ترکیبی میں پلاٹ، کردار نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور اسلوب بیان اہم ہیں۔

پلاٹ: مثنوی میں پلاٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ پلاٹ جتنا مربوط ہوگا، مثنوی اتنی ہی کامیاب ہوگی۔ یعنی واقعات کو ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ واقعات کے بیان میں کہیں بھی بے ربطی یا بے ترتیبی مثنوی میں نقص پیدا کردیتی ہے۔ اس لیے واقعات کے تسلسل کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور یہی چیز کہانی میں دلچسپی برقرار رکھنے کا باعث ہوتی ہے۔ شبلی نعمانی کے بقول حسن ترتیب ہی اصل شئے ہے جس پر مثنوی کی کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے اور اگر واقعات کا دروبست صحیح نہیں ہو یا اس میں لوچ ہو تو یہ مثنوی کی بڑی خامی ہے۔ یہاں حسن ترتیب سے مراد پلاٹ کے درمیان منطقی ربط و تسلسل اور ربط کلام ہے۔

کردار نگاری: مثنوی بیانیہ شاعری ہے۔ اس میں کہانی بیان ہوتی ہے اور کہانی مختلف طرح کے کرداروں کا مجموعہ

ہوتی ہے۔ یہ کردار مختلف عمر اور پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر ایک کردار کا اپنا جداگانہ انداز، رہن سہن اور انداز تکلم ہوتا ہے۔ مثنوی نگار شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ جس شخص کا بیان کرے اس کی تمام امتیازی خصوصیات کو قائم رکھے۔ یہ وصف مثنوی نگار کو کام یاب اور مثنوی کو پُر لطف بناتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''پلاٹ کے علاوہ کردار نگاری پر بھی بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔ خاص خاص کرداروں کو امتیازی خصوصیات کا مالک ہونا چاہیے۔ ایک کردار کا لب و لہجہ، طرز فکر و عمل، انداز قد دوسرے کردار سے مختلف ہونا چاہیے کیوں کہ زندگی میں یہی ہوتا ہے۔ مثنوی میں وہی کردار جاذبِ نظر اور موردِ توجہ ہوتے ہیں جن میں کوئی وصف مثلاً شوخی، ذکاوت و فطانت، وفاداری، انسانی ہمدردی، ایثار، رحم، بغض، کینہ، بے وفائی وغیرہ شدت سے ہو''۔
>
> (ڈاکٹر گیان چند جین، اردو مثنوی شمالی ہند میں، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص:۸۳)

ایک اچھے اور کام یاب مثنوی نگار شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کرداروں کی خصوصیات پر گہری نظر رکھتا ہو اور کرداروں کو برتنے کے فن سے واقف ہو کہ کس کردار سے کون سا کام لینا ہے اور اسے کب جگہ دینی ہے۔ ورنہ مثنوی میں خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ بہترین کردار وہ مانے جاتے ہیں جو شاعر کے دماغ کی پیداوار معلوم نہ ہو کر اپنے عہد اور ماحول کی پیداوار معلوم ہوں۔

واقعہ نگاری: شبلی نے واقعہ نگاری کو مثنوی کے لیے اہم مانا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ واقعہ نگاری میں کسی طرح کا نقص مثنوی کو بے جان کر دیتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قصہ یا واقعے کے بیان کے وقت شاعر خصوصی توجہ سے کام لے۔ یہ واقعہ فطری ہو یا مافوق الفطری، رزمیہ ہو یا بزمیہ، اخلاقی ہو یا فلسفیانہ، ہر جگہ بندش کی چستی ہونی چاہیے۔ واقعات چھوٹے ہوں یا بڑے مگر انھیں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ مثنوی کا ایک اہم وصف بیان اور صراحت و وضاحت ہے۔ مثنوی میں واقعات کے بیان میں مقام اور زمان کے علاوہ مواقع، مناظر اور نفسیاتی کیفیات کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے ایسے میں شاعر کی قوت متخیلہ جتنی زیادہ پُر اثر ہوگی، مثنوی اتنی ہی عمدہ اور پُر لطف ہوگی۔ مثنوی نگار شاعر مثنوی میں بیانیہ، توضیحی اور نفسیاتی شاعری کے علاوہ غنائی اور طربیہ شاعری کے دل کش نمونے بھی پیش کر سکتا ہے۔ واقعات کے بیان میں شاعر کا ڈرامائی نقطۂ نظر اسے عمدہ بناتا ہے۔ اس لیے شاعر بیان واقعہ میں مکالموں کا سہارا لیتا ہے۔ شاعر مکالموں میں روزمرہ اور محاوروں کے ذریعے بات چیت سے حسن پیدا کرتا ہے اور متکلم کی حیثیت کو ملحوظ رکھتا ہے تو مثنوی

میں ڈراما کا لطف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

جذبات نگاری: جذبات نگاری بھی مثنوی کا اہم جزو ہے۔ کام یاب اور بہتر مثنوی وہ مانی جاتی ہے جس میں کرداروں کے جذبات کا بیان فطری اور دل چسپ انداز میں ہوا ہوتا کہ قاری پر بھی وہ جذباتی کیفیات طاری ہوں۔ جذبات کی مرقع کشی مثنوی میں حیرت انگیز دل کشی پیدا کرتی ہے۔

منظر نگاری: مثنوی میں کسی مقام کے فطری حسن یا ویرانی کے بیان یا بعض موثر اوقات کی تصویر کشی کرنے کو منظر نگاری کہتے ہیں۔ مقامات وفطری مناظر اور اوقات کا بیان جتنا دل کش اور پُر لطف ہوگا، مثنوی اتنی ہی کام یاب اور دل چسپ ہوگی۔ مثنوی نگار شاعر منظر نگاری کے ذریعے مثنوی میں سماں باندھ دیتا ہے اور قاری کو مسحور کر لیتا ہے، حسین منظر نگاری جمالیاتی کیفیت پیدا کرتی ہے اور قصے یا واقعے کو بھی دل چسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اسلوب بیان: صنفِ مثنوی میں زبان و بیان کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ زبان جتنی صاف، سلیس اور اندازِ بیان جتنا دل پذیر ہوگا، مثنوی اتنی ہی عمدہ اور دل چسپ ہوگی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''معنی کے ساتھ ساتھ طرزِ اظہار بھی دل کش ہونا چاہیے۔ جمالیاتی پہلو طرزِ اظہار اور اسلوبِ بیان سے زیادہ وابستہ ہے۔ اگر ظاہر خراب ہوگا تو باطن کا حُسن گدڑی کے لعل کی طرح پوشیدہ رہے گا۔ اچھی مثنوی کی زبان نہایت صاف اور رواں ہونی چاہیے۔ جذبات نگاری اور شستہ زبان یہی دو خاص اوصاف ہیں جن پر مثنوی کے مرتبہ کا انحصار ہوتا ہے۔ اردو کے تمام اچھے مثنوی گو زبان کے فن کار ہیں۔ شمالی ہند میں اردو کی بہترین مثنویاں میر، میر حسن، نسیم اور شوق لکھنوی کی ہیں۔ ان چاروں میں صناعیِ زبان وصفِ مشترک ہے۔ ان کے ہم عصروں میں کوئی دوسرا مثنوی نگار ان سے بہتر زبان نہ لکھ سکا''۔
>
> (ڈاکٹر گیان چند جین، اردو مثنوی شمالی ہند میں، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص:۸۱،۸۲)

مثنوی کو لافانی بنانے میں زبان و انداز بیان کا اہم کردار ہوتا ہے۔ مثنوی میں پر تکلف زبان و بیان کے مقابلے میں سادہ و پرکار اسلوب زیادہ موثر ہوتا ہے۔ کام یاب مثنوی نگار صناعی پر وقت صرف نہیں کرتے بلکہ شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کا خیال رکھتے ہوئے منفرد اسلوب اور طرز بیان اپناتے ہیں اور کرداروں سے اس کے حسب حال الفاظ ادا کراتے ہیں جس سے مثنوی میں لطافت و دل کشی پیدا ہوتی ہے۔ مثنوی میں زبان انتہائی

صاف ستھری، شستہ، سلیس اور دل کش ہونی چاہیے تاکہ واقعات کا بیان دل چسپ ہو اور قاری کی توجہ واقعات پر مرکوز رہے۔

9.3.3 مثنوی کی فنی خصوصیات

صنفِ مثنوی فارسی ادب سے مستعار ہے۔ عربی میں اس کا وجود نہیں تھا۔ رودکی کی مثنوی 'کلیلہ و دمنہ' کا شمار قدیم ترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اردو میں مثنوی کا آغاز دکن سے ہوا۔ اردو کی ابتدائی مثنویاں صوفیاے کرام کے ذریعے وجود میں آئیں اور مذہبی موضوعات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئیں۔ اس میں حمد، نعت، منقبت، مناجات اور مدح بادشاہ یا امرا کے قصے بیان ہوتے تھے۔ اس طرح ابتدائی دور کی مثنویوں کے موضوعات دین، پند و نصائح اور اخلاقیات سے مستعار ہیں یعنی ابتدائی دور میں اس کے موضوعات پر مذہب کی چھاپ رہی۔ آگے چل کر عشق و محبت مثنوی کا محبوب اور حاوی موضوع قرار پائی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں زیادہ تر مثنویاں عشقیہ قصوں اور مہمات کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ کچھ اردو مثنویوں کے موضوعات رزمیہ بھی رہے ہیں۔ چوں کہ اردو مثنوی فارسی کے زیرِ اثر پروان چڑھی، اس لیے اردو مثنوی نے فارسی مثنوی کے رنگ کو اپنایا جس کا ایک پہلو رزم بھی ہے۔ اردو کی رزمیہ مثنویوں میں نصرتی کی 'علی نامہ'، رستمی کی 'خاور نامہ' اور حسن شوقی کی 'ظفر نامہ' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے بعد اردو میں رزمیہ مثنوی کا قحط سا دکھائی دیتا ہے۔ اردو کی جدید مثنویاں قدیم مثنویوں سے کچھ حد تک منفرد ہیں۔ اس میں تاریخی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور عشقیہ کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ امداد امام اثر نے موضوعات کے لحاظ سے مثنوی کی تقسیم اس طرح کی ہے:

۱۔ رزمی مضامین

۲۔ بزمی مضامین

۳۔ حکمت آموز مضامین

۴۔ تصوف آمیز مضامین

۵۔ متفرق مضامین

گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' میں مثنوی کی تقسیم درج ذیل انداز میں کی ہے:

۱۔ مذہبی مثنویاں

۲۔ تاریخی مثنویاں

۳۔ وہ مثنویاں جن میں ہندوستان کے معاشرتی کوائف و آثار کی تفصیل ملتی ہیں

۴۔ وہ مثنویاں جو ہندوستان کے فطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں ہیں

۵۔ وہ مثنویاں جن میں حب الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں

۶۔ ہندوستانی قصے، کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں جن کا تعلق ان قصوں سے ہے جو ہندوستان کی قدیم روایتوں اور لوک کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔

موضوعات کے اعتبار سے مثنوی کو جس طرح یہاں تقسیم کیا گیا ہے، اس سے یہ قطعی نہیں سمجھنا چاہیے کہ مثنوی کا دائرہ محدود ہے۔ مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے لیے موضوعات کی قید نہیں ہے۔ اس میں مختلف قسم کے موضوعات اور متفرق مضامین کو سمیٹنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ اردو میں زیادہ تر مثنویاں عشقیہ موضوعات پر کہی گئی ہیں۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ اردو مثنوی کا اصل دائرہ داستان عشق کا بیان ہے اور اس کی رنگینی کی توضیح اس کا خاصہ ہے۔ جدید دور میں مثنوی ایک منظّم داستان عشق ہے جس میں عشقیہ جذبات کے ساتھ ساتھ متعلقہ علاقے کے رسم ورواج، تہذیب وثقافت اور معاشرے کے نقوش صاف صاف دکھائی دیتے ہیں۔

مثنوی کے فن میں واقعات کی ترتیب وتنظیم، تسلسل خیال، مربوط بیان، سلاستِ زبان اور کسی خاص موضوع اور مسئلے کو ارتقائی منازل تک پہنچانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شبلی نعمانی نے مثنوی کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں، سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہوسکتے ہیں۔ جذبات انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخیل، ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔۔۔ اس آسانی اور وسعت کی وجہ یہ ہے کہ مثنوی کا ہر شعر علاحدہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ پابندی نہیں ہوتی کہ پوری نظم ایک ہی قافیہ میں ادا کی جائے جیسا کہ غزل اور قصیدہ میں یہ لازمی ہے۔ مثنوی کے لیے اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں۔ اس لیے جس قدر وسعت دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ مضامین کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ رزمیہ، عشقیہ، تصوف، فلسفہ، واقعہ نگاری، جو مضمون چاہیں مثنوی میں ادا کر سکتے ہیں''۔
>
> (شبلی نعمانی، شعر العجم، حصہ چہارم، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۹۵، ۱۹۶)

مثنوی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں عشقیہ واقعات کے بیان کو اولیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے مثنوی میں زندگی کے تمام پہلو داخل ہوجاتے ہیں اور پورے معاشرتی نظام اور انسانی جذبات جیسے عشق ومحبت،

رنج وغم، غیض وغضب اور کینہ وانتقام وغیرہ کا عکس صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔مثنوی میں مناظرِ فطرت جیسے بہاروخزاں، گرمی وسردی، صبح وشام، جنگل و بیابان اور کوہ وصحرا وغیرہ کے مناظر کی جھلک اور حسین تصویر کشی جس طرح دیکھنے کو ملتی ہے، اس طرح اردو کی کسی اور صنفِ شاعری میں نظر نہیں آتی۔

مثنوی کا فن مربوط فکر وخیال، احساس تناسب، ترتیب وتنظیم اور تعمیر کی صلاحیتوں کو بروے کار لانے کا تقاضہ کرتا ہے۔مثنوی کا فن بہت زیادہ توجہ، محنت، غور وفکر اور مسلسل انہماک چاہتا ہے جس کے بعد ہی بہترین مثنویاں منظرِ عام پر آئیں۔مثنوی کی پہلی خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔خواہ وہ واقعہ فطری ہو یا مافوق فطری، رزمیہ ہو یا بزمیہ، اخلاقی ہو یا فلسفیانہ۔مثنوی کی دوسری خصوصیت منفرد اسلوب اور طرزِ بیان ہے جس میں شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کا کمال دکھانے کی پوری گنجائش موجود ہے۔مثنوی کی کام یابی کا دارومدار تسلسل بیان اور مربوط فکر پر ہے۔اس لیے شاعر کی توجہ واقعات کے ارتقا، ترتیب وتنظیم اور ربط پہ ہونی چاہیے۔مثنوی کا تیسرا وصف دل کش اندازِ بیان اور وضاحت وصراحت ہے۔اس کے تحت زمان ومکاں کے علاوہ مواقع، مناظر اور نفسی کیفیات کی توضیحات بھی شامل ہیں۔مثنوی کا چوتھا اہم وصف ڈرامائی نقطۂ نظر ہے۔مثنوی گو شاعر مکالماتی انداز بھی اپناتا ہے۔جب مکالموں میں وہ روزمرہ اور محاوروں کے ذریعے بات چیت کا حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور متکلم کی حیثیت کو ملحوظ رکھتا ہے تو مثنوی میں ڈراما کا سا لطف پیدا ہوجاتا ہے۔مثنوی میں مقصد بھی بڑی اہم چیز ہے جس پر شاعر عمارت کھڑی کرتا ہے۔بعض اوقات اس میں نقص آنے پر اس کے اعتبار میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔اس لیے شاعر اپنا زورِ تخیل بروے کار لاتے ہوئے اس میں زیادہ وقت لگاتا ہے۔یہ مقصد مذہبی اور اخلاقی بھی ہوسکتا ہے اور معاشرتی اور فلسفیانہ بھی۔اس طرح مثنوی دل چسپ فن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت بسیط، مرکب اور کسی قدر پیچیدہ فن ہے۔اس فن کو اردو کے بیش تر ناقدین نے اہمیت کا حامل بتایا ہے۔کہا گیا ہے کہ ترقی یافتہ تمدن اور معاشرے کے لازمی ذہنی اور ذوقی لوازم کے طور پر جب تک مربوط خیالی اور واقعات کے ارتقا دینے اور ایک معین مقصد پر ان کو اختتام تک پہنچانے کی قدر ومنزلت باقی رہے گی، مثنوی کی اہمیت نہیں گھٹ سکتی۔

9.3.4 حاصلِ مطالعہ

مثنوی اس طویل نظم کا نام ہے جس میں کوئی قصہ یا واقعہ ربط وتسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے، خیال مربوط ہو، بات سے بات نکلے اور قصہ بتدریج آگے بڑھے۔مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس میں رزم وبزم، اخلاق و فلسفہ اور عشقیہ قصے غرض ہر طرح کے موضوعات منظوم انداز میں بیان کیے جاتے ہیں۔مثنوی میں غزل کی طرح رمزیاتی وکنایاتی انداز بیان نہیں اپنایا جاتا بلکہ توضیحی انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے اور واقعات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے تاکہ واقعات قاری کو آسانی کے ساتھ ذہن نشیں ہوجائیں۔مثنوی بیانیہ صنفِ شاعری

مثنوی کی تعریف، اجزاے ترکیبی اور فنی خصوصیات

ہے۔اس میں مربوط و مسلسل انداز میں کسی قصہ یا واقعہ کا بیان ہوتا ہے۔اس قصہ یا واقعہ کو آگے بڑھانے کے لیے کرداروں کو وضع کیا جاتا ہے۔ قصے یا واقعات کو ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کا نام پلاٹ ہے۔ایک مضبوط پلاٹ اچھی مثنوی کا ضامن ہوتا ہے۔مثنوی میں کرداروں کے جذبات بھی بیان ہوتے ہیں اور تہذیب و معاشرت کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔اس لیے مثنوی میں زبان اور اندازِ بیان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پلاٹ، کردارنگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظرنگاری اور اسلوب بیان، یہ سب مثنوی کے اجزاے ترکیبی کہلاتے ہیں۔مثنوی کے فن میں واقعات کی ترتیب و تنظیم، تسلسل خیال، مربوط بیان، سلاستِ زبان اور کسی خاص موضوع اور مسئلے کو ارتقائی منازل تک پہنچانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔مثنوی کا فن مربوط فکر و خیال، احساس تناسب، ترتیب و تنظیم اور تعمیر کی صلاحیتوں کو بروے کار لانے کا تقاضہ کرتا ہے۔مثنوی کا فن بہت زیادہ توجہ، محنت، غور و فکر اور مسلسل انہاک چاہتا ہے جس کے بعد ہی بہترین مثنویاں منظرِ عام پر آئیں۔مثنوی کی پہلی خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔خواہ وہ واقعہ فطری ہو یا مافوق فطری، رزمیہ ہو یا بزمیہ، اخلاقی ہو یا فلسفیانہ۔مثنوی کی دوسری خصوصیت منفرد اسلوب اور طرزِ بیان ہے جس میں شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کا کمال دکھانے کی پوری گنجائش موجود ہے۔مثنوی کی کام یابی کا دار و مدار تسلسل بیان اور مربوط فکر پر ہے۔اس لیے شاعر کی توجہ واقعات کے ارتقا، ترتیب و تنظیم اور ربط پہ ہونی چاہیے۔مثنوی کا تیسرا وصف دل کش اندازِ بیان اور وضاحت و صراحت ہے۔اس کے تحت زمان و مکاں کے علاوہ مواقع، مناظر اور نفسی کیفیات کی توضیحات بھی شامل ہیں۔ مثنوی کا چوتھا اہم وصف ڈرامائی نقطۂ نظر ہے۔مثنوی گو شاعر مکالماتی انداز بھی اپناتا ہے۔جب مکالموں میں وہ روزمرہ اور محاوروں کے ذریعے بات چیت کا حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور متکلم کی حیثیت کو ملحوظ رکھتا ہے تو مثنوی میں ڈراما کا سا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔مثنوی میں مقصد بھی بڑی اہم چیز ہے جس پر شاعر عمارت کھڑی کرتا ہے۔بعض اوقات اس میں نقص آنے پر اس کے اعتبار میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔اس لیے شاعر اپنا زورِ تخیل بروے کار لاتے ہوئے اس میں زیادہ وقت لگاتا ہے۔یہ مقصد مذہبی اور اخلاقی بھی ہو سکتا ہے اور معاشرتی اور فلسفیانہ بھی۔اس طرح مثنوی دل چسپ فن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت بسیط، مرکب اور کسی قدر پے چیدہ فن ہے۔اس فن کو اردو کے بیش تر ناقدین نے اہمیت کا حامل بتایا ہے۔کہا گیا ہے کہ ترقی یافتہ تمدن اور معاشرے کے لازمی ذہنی اور ذوقی لوازم کے طور پر جب تک مربوط خیالی اور واقعات کے ارتقا دینے اور ایک معین مقصد پر ان کو اختتام تک پہنچانے کی قدر و منزلت باقی رہے گی، مثنوی کی اہمیت نہیں گھٹ سکتی۔جدید دور میں غزل کی مقبولیت کے سبب مثنویوں کا فقدان نظر آتا ہے لیکن کلاسیکی شعری اصناف میں اردو مثنوی اپنے موضوعات کے تنوع، اسلوب کی ندرت اور طرزِ بیان کی خوبیوں کی بدولت اہم مقام رکھتی ہے۔

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف سے آگہی حاصل کی۔
- مثنوی کے اجزائے ترکیبی سے واقفیت حاصل کی۔
- مثنوی کے فن سے بحث کی۔
- مثنوی کے فن کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھا۔
- مثنوی کے فن کی انفرادیت اور اہمیت کو جانا۔

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف بیان کیجیے۔

۲۔ مثنوی کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہیں؟

۳۔ مثنوی میں منظر نگاری سے کیا مراد ہے؟

۴۔ مثنوی اور غزل کے درمیان فرق کو واضح کیجیے۔

۵۔ مثنوی کے فن پر اظہارِ خیال کیجیے۔

9.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مثنوی عربی لفظ ہے۔ اس کا مادہ ث ن ی ہے۔ مثنوی کا لفظ عربی کے لفظ 'مثنیٰ' سے بنایا گیا ہے۔ مشہور عربی لغت 'المعجم الوسیط' میں اس لفظ سے متعلق اس طرح لکھا گیا ہے:

''المثنوی من الشعر ما کان فیہ کل شطرین بقافیۃ واحدۃ''

(المعجم الوسیط: مرتبین: ابراہیم مصطفیٰ، احمد حسن وغیرہم، المکتبہ الاسلامیہ، ترکی، ۱۹۷۲ء، جلد اول، ص: ۱۰۲)

یعنی وہ شعر جس کے دونوں مصرعے ایک قافیہ میں ہوں۔ 'فرہنگ آصفیہ' میں مثنوی اسم مؤنث منسوب بہ 'مثنیٰ' ہے جس کے معنی 'دو' کے ہیں۔ اصطلاح میں مثنوی اس شعری صنف اور مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر دوسرے شعر میں قافیہ بدل جائے لیکن پوری مثنوی میں ایک ہی بحر کی پابندی کی گئی ہو۔

۲۔ مثنوی کے اجزائے ترکیبی پلاٹ، کردار نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور اسلوب

بیان ہیں۔

۳۔ مثنوی میں کسی مقام کے فطری حسن یا ویرانی کے بیان یا بعض موثر اوقات کی تصویر کشی کرنے کو منظر نگاری کہتے ہیں۔ مقامات و فطری مناظر اور اوقات کا بیان جتنا دل کش اور پُر لطف ہوگا، مثنوی اتنی ہی کام یاب اور دل چسپ ہوگی۔ مثنوی نگار شاعر منظر نگاری کے ذریعے مثنوی میں سماں باندھ دیتا ہے اور قاری کو مسحور کر لیتا ہے، حسین منظر نگاری جمالیاتی کیفیت پیدا کرتی ہے اور قصے یا واقعے کو بھی دل چسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

۴۔ مثنوی اور غزل موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے شاعری کی جداگانہ اصناف ہیں۔ غزل منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مثنوی میں مربوط فکر اور تسلسل بیان سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ غزل کا فن غنائی اور ایمائی ہوتا ہے۔ جب کہ مثنوی کا فن بیانیہ اور توضیحی ہوتا ہے۔ غزل میں واقعہ نگاری نہیں ہوتی جب کہ یہ مثنوی کی جان ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے غزل کے تمام اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں جب کہ مثنوی میں ہر شعر کا قافیہ الگ الگ ہوتا ہے۔

۵۔ مثنوی کا فن مربوط فکر و خیال، احساس تناسب، ترتیب و تنظیم اور تعمیر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا تقاضہ کرتا ہے۔ مثنوی کا فن بہت زیادہ توجہ، محنت، غور و فکر اور مسلسل انہماک چاہتا ہے۔ مثنوی کی پہلی خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔ دوسری خصوصیت منفرد اسلوب اور طرزِ بیان ہے جس میں شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کا کمال دکھانے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ مثنوی کی کام یابی کا دار و مدار تسلسل بیان اور مربوط فکر پر ہے۔ اس لیے شاعر کی توجہ واقعات کے ارتقا، ترتیب و تنظیم اور ربط پہ ہونی چاہیے۔ مثنوی کا تیسرا وصف دل کش اندازِ بیان اور وضاحت و صراحت ہے۔ اس کے تحت زمان و مکاں کے علاوہ مواقع، مناظر اور نفسی کیفیات کی توضیحات بھی شامل ہیں۔ مثنوی کا چوتھا اہم وصف ڈرامائی نقطۂ نظر ہے۔ مثنوی گو شاعر مکالماتی انداز بھی اپناتا ہے۔ جب مکالموں میں وہ روزمرہ اور محاوروں کے ذریعے بات چیت کا حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور متکلم کی حیثیت کو ملحوظ رکھتا ہے تو مثنوی میں ڈراما کا سا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثنوی میں مقصد بھی بڑی اہم چیز ہے جس پر شاعر عمارت کھڑی کرتا ہے۔ بعض اوقات اس میں نقص آنے پر اس کے اعتبار میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس لیے شاعر اپنا زورِ تخیل بروئے کار لاتے ہوئے اس میں زیادہ وقت لگاتا ہے۔ یہ مقصد مذہبی اور اخلاقی بھی ہو سکتا ہے اور معاشرتی اور فلسفیانہ بھی۔ اس طرح مثنوی دل چسپ فن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت بسیط، مرکب اور کسی قدر پے چیدہ فن ہے۔ اس فن کو اردو کے بیش تر ناقدین نے اہمیت کا حامل بتایا ہے۔

9.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معنی)
مثنوی	دو دو والا، نظم کی ایک قسم جس میں کوئی مسلسل بات بیان کی جاتی ہے۔ اس میں ہر شعر کا قافیہ جدا لیکن ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور اشعار کی تعداد مقرر نہی ہوتی
مثنیٰ	دو دو
رزمیہ	جنگ یا جنگی مہم جوئی سے متعلق
بزمیہ	محفل یا مجلس عیش و طرب سے متعلق
رمز	اشارہ، ایما
کنایہ	اشارہ، ایما، مبہم بات
گیتی پناہ	بادشاہ
مستعار	ادھار لینا
حشمت	شان و شوکت، دبدبہ
جاہ	رتبہ، منصب، عزت، قدر و منزلت
منال	مال و اسباب، دھن دولت
فرخندہ	مبارک، سعید
باج	محصول، خراج، زر مال گذاری
خطا	چین کا ایک شہر جو مشک کے لیے مشہور ہے
در و بست	جوڑ، ترتیب، نظم، بندش

9.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اُردو مثنوی کا ارتقا : عبدالقادر سروری

۲۔ اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں : سید محمد عقیل رضوی

۳۔ جنوبی و شمالی ہند کی تاریخی مثنویاں : کندن لال کندن

۴۔ اردو کی تین مثنویاں : پروفیسر خان رشید

۵۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں : پروفیسر گیان چند جین

اکائی 10 مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

10.3.1 مثنوی کے موضوعات

10.3.2 مثنوی کی اقسام

10.3.3 ماحصل

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

10.6 سوالوں کے جوابات

10.7 فرہنگ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- مثنوی کے موضوعات سے واقف ہوں گے۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کو سمجھیں گے۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنوی نگاروں سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنویوں کی خصوصیات وامتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- جدید دور میں مثنوی کے موضوعات میں جو بدلاؤ آیا، اس کے بارے میں جان کاری حاصل کریں گے۔

10.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور اس کی فنی خصوصیات سے واقف ہوئے۔

آپ نے یہ بھی جان کاری حاصل کی کہ مثنوی کلاسیکی اردو شاعری کی نمائندہ صنف ہے۔اب اس اکائی میں آپ مثنوی کے موضوعات، اس کی مختلف اقسام کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے،مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنوی نگاروں اور نمائندہ مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات سے واقف ہوں گے اور جدید دور میں اردو مثنوی کے موضوعات میں جو بدلاؤ آیا، اسے سمجھیں گے۔

10.3 مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

10.3.1 مثنوی کے موضوعات

اردو شاعری میں غزل کے بعد مثنوی سب سے مقبول صنفِ سخن رہی ہے۔مثنوی بیانیہ اور توضیحی صنفِ شاعری ہے۔موضوعات کے اعتبار سے مثنوی اپنے اندر بے حد گنجائش رکھتی ہے۔اس میں موضوع کی کوئی پابندی یا قید نہیں ہے۔معمولی سے معمولی چیز اس کا موضوع بن سکتی ہے۔کائنات عالم کی ہر چیز، ہر طرح کے داخلی و خارجی مضامین کو مثنوی اپنے اندر سمونے کی اہلیت رکھتی ہے۔علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب 'شعرالعجم' میں صنفِ مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''انواعِ شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔شاعری کے جس قدر انواع ہیں، سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔جذبات انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخئیل ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔اس بنا پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں، سب اس میں آجاتے ہیں۔عشق ومحبت، رنج ومسرت، غیظ وغضب، کینہ و انتقام غرض جس قدر انسانی جذبات ہیں، سب کے یہاں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے۔تاریخ میں مختلف اور گونا گوں واقعات پیش آتے ہیں، اس لیے ہر قسم کی واقعہ نگاری کا کمال دکھایا جاسکتا ہے۔مناظرِ قدرت، بہار وخزاں، گرمی وسردی، صبح وشام یا جنگل و بیابان، کوہ وصحرا، سبزہ زار وغیرہ کی تصویر کھینچی جاسکتی ہے۔اخلاق، فلسفہ، تصوف کے مسائل نہایت تفصیل سے ادا کیے جاسکتے ہیں....مثنوی کے لیے اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں اس لیے جس قدر وسعت دینا چاہیں دے سکتے ہیں، مضامین کی بھی کوئی تخصیص نہیں؛ رزمیہ، عشقیہ، تصوف، فلسفہ، واقعہ نگاری جو مضمون چاہیں، مثنوی میں ادا کر سکتے ہیں۔''

(علامہ شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد چہارم، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء،

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

ص: ۲۰۶،۲۰۵)

صنفِ مثنوی کے سلسلے میں خواجہ الطاف حسین حالی کی رائے ہے۔

''مثنوی، اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے کیوں کہ غزل یا قصیدے میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے، ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہو سکتی..... الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں، ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص: ۲۰۳،۲۰۲)

امداد امام اثر صنفِ مثنوی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنفِ شاعری کو حاصل ہے، کسی اور صنف کو نہیں ہے۔ ہر طرح کے داخلی اور خارجی مضامین اس میں گنجائش پاتے ہیں...... یہ وہ صنفِ شاعری ہے جس میں شاعر شاعری کا کمال حسب مراد دکھلا سکتا ہے۔''

(امداد امام اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ، وہاب اشرفی، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۲ء، ص: ۵۶۰،۵۵۹)

مذکورہ اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مثنوی کے لیے موضوعات کی تخصیص نہیں ہے۔ شاعر جو موضوع چاہے، مثنوی کی ہیئت میں نظم کر سکتا ہے۔ بیانیہ حکایتیں، تصوف و اخلاقیات، عقائد و کلام، تفسیر و فقہ، ہجو و مدح، طنز و مزاح، سیاست و صحافت، مکتوب و آپ بیتی، علوم و فنون، ساقی نامہ، بارہ ماسہ، عشق و عاشقی کی داستان، پریوں، دیوزادوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے دل فریب قصے، رسم و رواج یہاں تک کہ نحو و صرف کی مثالیں اور بچوں کا ادب، ایسا کون سا موضوع ہے جسے مثنوی کی ہیئت میں نظم نہیں کیا گیا ہو۔ مذہبی واقعات، پند و نصائح، داستان حسن و محبت، میدان جنگ کی معرکہ خیزی، بزمِ طرب کی دل آویزی، رسوماتِ شادی و بیاہ، حیرت انگیز مافوق الفطری کارنامے اور تاریخ کے علاوہ شہرِ آشوب سبھی کچھ مثنویوں کا موضوع ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کے مضامین میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ اردو میں مثنوی کو عشقیہ موضوعات زیادہ راس آئے اور شعرائے اردو نے اس موضوع پر لازوال تخلیقات پیش کیں۔ مُلّا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' سراج اورنگ آبادی کی مثنوی 'بوستان خیال' میر تقی میر کی مثنوی 'دریائے عشق' اور 'شعلۂ عشق' میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' میر اثر کی مثنوی

'خواب وخیال' دیاشنکرنسیم کی مثنوی 'گلزارنسیم' نواب مرزا شوق کی مثنوی 'زہرعشق' اور داغ دہلوی کی مثنوی 'فریاد داغ' جیسی مشہور مثنویاں بنیادی طور پر عشقیہ موضوعات پر مبنی ہیں۔اس لحاظ سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اردو میں صنفِ مثنوی کا بنیادی موضوع عشق رہا ہے۔اردو مثنوی نے ہر عہد میں زیادہ تر چند مخصوص موضوعات کو ہی عزیز جاں بنائے رکھا۔اردو اور فارسی کی اہم مثنویوں پر غور کریں تو عشق و عاشقی کی داستان بیان کرنے والی، رزمیہ، حکمت وفلسفہ، اخلاق و آداب نیز مذہبی موضوعات کو پیش کرنے والی مثنویوں کی تعداد دیگر موضوعات پر لکھی گئی مثنویوں سے کہیں زیادہ ہے۔

مثنوی کے موضوعات کے اسی تنوع کے پیش نظر اردو کے اہم ناقدین نے موضوع کے لحاظ سے اس کی تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔علامہ شبلی نعمانی نے رزمیہ، عشقیہ، اخلاق قصہ وافسانہ، تصوف وفلسفہ کے تحت اردو مثنوی کی تقسیم کی ہے۔امداد امام اثر نے رزم، بزم، حکمت، تصوف اور دیگر متفرقات کے طور پر مثنویوں کی موضوعاتی تقسیم کی ہے جب کہ گیان چند جین نے موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کی تقسیم کو پیچیدہ عمل قرار دیا ہے اور ایسی تقسیم کو غیر مستحسن قرار دیا ہے۔البتہ انھوں نے اردو کی طویل مثنویوں میں برتے گئے موضوعات کی فہرست سازی یوں کی ہے:

> ''اردو میں ذیل کے موضوعات پر طویل مثنویاں لکھی گئیں۔۱۔ دیو وپری کی داستانیں جن میں عشق کا نمایاں مقام ہے۔۲۔ واردات عشق، ان میں قصہ کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔۳۔معرفت، ۴۔ مذہب، ۵۔ تاریخ وسوانح، ۶۔ رزم، ۷۔اخلاق وفلسفہ۔جدید دور میں ملی، قومی اور سماجی مسائل، مناظرِ قدرت پر بھی مثنویاں لکھی گئیں۔شاذ ونادران موضوعات کے علاوہ بھی مثنویاں لکھی گئیں۔مثلاً کھٹمل، پسّو، مچھر وغیرہ کی مذمت میں لیکن یہ متنوع موضوعات مختصر مثنویوں تک محدود رہے۔''
>
> (ڈاکٹر گیان چند جین، اردو مثنوی شمالی ہند میں، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، ص:۹۰)

اردو کے اہم نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' میں مقامی موضوعات کے اعتبار سے مثنوی کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) مذہبی مثنویاں (۲) تاریخی مثنویاں (۳) معاشرتی کوائف و آثار سے متعلق مثنویاں (۴) فطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں مثنویاں (۵) حب الوطنی سے متعلق مثنویاں (۶) ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں۔

مذکورہ بالا تفصیلات موضوع کے اعتبار سے مثنوی کی متعدد اقسام پر روشنی ڈالتی ہیں۔حالاں کہ ایسی تقسیم بہت کارآمد نہیں ہوسکتی ہے کیوں کہ ایک ہی مثنوی کئی کئی موضوعات پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے۔کبھی ایک مثنوی عشق کے

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

جذبات کو بیان کرتی ہے تو وہیں تصوف وسلوک کے موضوعات کو بھی پیش کرتی ہے۔ کوئی مثنوی تاریخی واقعات پر مبنی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں رزم و بزم کا بیان بھی موجود ہے۔ ایسی بہت سی مثنویاں مل جائیں گی جن کو کسی ایک موضوع کے تحت نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر اردو مثنویوں میں برتے گئے موضوعات کو غور سے دیکھیں تو اردو مثنویوں کی اقسام اس طرح قائم کر سکتے ہیں۔

اخلاقی، داستانوی، رزمیہ، عشقیہ اور متفرق اقسام۔

10.3.2 مثنوی کی اقسام

اخلاقی مثنویاں: اردو کی بیش تر ابتدائی مثنویاں تصوف و مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے انھیں مذہبی یا متصوفانہ قسم کی مثنویاں کہا جاتا ہے۔ ان مثنویوں کو اخلاقی مثنویوں کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان مثنویوں کا موضوع تصوف، مذہبی تعلیمات اور انسانی و اخلاقی اقدار رہا ہے۔ مثنوی کے ابتدائی نمونوں کے تعلق سے عبدالسلام ندوی نے قطب شاہ کی ایک نعتیہ مثنوی کا ذکر کیا ہے جب کہ بعض لوگوں نے 'قطب مشتری' کو باضابطہ ابتدائی نمونہ تسلیم کیا ہے۔ حالاں کہ بعد میں سامنے آنے والی تحقیق سے یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے اور تحقیق کاروں نے بتایا ہے کہ مثنوی کے جو قدیم ترین نمونے ملتے ہیں، وہ بابا شیخ فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔ اسی طرح بعض محققین نے حضرت امیر خسرو کے کلام کے بعض حصوں کو اولین نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ کچھ محققین نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ بہاؤالدین برناوی اور سید ہاشم حسین علوی کے ملفوظات میں مثنوی کے ابتدائی نقوش کی نشان دہی کی ہے۔ ان تمام ابتدائی نمونوں کا نمایاں موضوع تصوف اور مذہب ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق حسن و عاشق کے موضوع پر پہلی طویل مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' ہے۔

مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' سے قبل یا اس کے آس پاس کئی اہم مثنویاں وجود میں آ چکی تھیں۔ اشرف بیابانی کی مثنوی 'نوسر ہار' یا پھر 'واحد باری' کا موضوع مذہب ہی ہے۔ 'واحد باری' کی تخلیق اشرف بیابانی نے امیر خسرو کے کلام 'خالق باری' کے طرز پر کی تھی۔ خوب محمد چشتی کی 'خوب ترنگ' شاہ میراں جی کی 'خوش نامہ' ابتدائی دور کی مثنویاں ہیں جن میں مذہبی و متصوفانہ موضوعات کا استعمال کیا گیا ہے۔ محبوب عالم شیخ محمد جیون کی مثنویاں 'محشر نامہ'، 'درد نامہ'، 'خواب نامہ پیغمبر' اور 'دھیر نامہ بی بی فاطمہ' مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ جہاں 'محشر نامہ' میں مذہبی عقائد و فقہی مسائل کا ذکر ہے وہیں 'درد نامہ' میں رسول دو عالم ﷺ کی ولادت باسعادت اور وفات کا ذکر ملتا ہے۔ منیر شکوہ آبادی، محسن کاکوروی اور جگن ناتھ خوشتر وغیرہ نے مذہبی رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہوئی مثنویاں تحریر کی ہیں۔ ہمارے عظیم ترین مثنوی نگار میر حسن کی 'رموز العارفین' مکارم اخلاق اور معارف و حکمت کے مضامین سے پُر ہے۔ اس مثنوی کے تعلق سے ایک اہم بات یہ کہی جاتی ہے کہ میر حسن نے 'منطق الطیر' اور مولانا روم کی مثنوی

سے تاثر قبول کیا ہے۔ اس لیے اس رنگ کے متعدد اشعار اس مثنوی کی زینت ہیں۔ مظفر علی اسیر کی مثنویاں 'معراج الفضائل'، 'ریاض المسلمین' اور 'خلاصۃ التقویٰ' مذہبی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہ تینوں طویل مثنویاں ہیں۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ اردو کے عظیم مرثیہ گو شاعر ہیں۔ ان کی مثنوی 'احسن القصص' دراصل رسول اللہ ﷺ اور اماموں کے حالاتِ زندگی اور فضائل و کمالات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں نعتیہ اشعار ہیں اور جنگ کے منظر نامے بھی تحریر کیے گئے ہیں۔

دکن کے بہت سے شعرا نے مذہب و تصوف اور اسلامی اقدار و شخصیات کے تناظر میں مثنویاں لکھی ہیں۔ اس لیے بلا تردد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ابتدائی دور کی اردو مثنویوں میں مذہب بہ طور موضوع خوب استعمال ہوا ہے۔ اردو میں اسلامی افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ تصوف و سلوک کے موضوعات نیز دیگر مذاہب جیسے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو نظر میں رکھ کر بھی مثنویاں تحریر کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعد کے ادوار میں بھی شعرا نے اس موضوع کو برتنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ اس لحاظ سے اردو مثنویوں میں مذہبی اور متصوفانہ قسم کی مثنویوں کی تعداد خاصی ہے۔

داستانوی اور عشقیہ مثنویاں: اردو میں زیادہ تر عشقیہ مثنویاں تحریر کی گئیں۔ اردو کے بیش تر کلاسیکی شعرا نے اردو مثنویوں میں داستانِ عشق رقم کرنے کا عمل انجام دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ادب نے اسے مثنوی کا بنیادی موضوع اور عشقیہ مثنوی کو مثنوی کی اہم قسم قرار دیا ہے۔ ان عشقیہ مثنویوں کو داستانوی مثنویوں کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اردو مثنویوں میں داستان طرازی کا انداز و اسلوب مختلف ضرور رہا ہے لیکن چاہے طبع زاد مثنویاں ہوں یا پھر کسی دوسری زبان سے ترجمہ شدہ ہوں، ان سب کے قصوں کا مرکزی نکتہ عشق ہی رہا ہے۔ مشہور ناقد ابوالکلام قاسمی اپنے مضمون 'اردو شاعری کی کلاسیکی شعریات' میں لکھتے ہیں:

> ''کہا جاتا ہے کہ مثنوی کا اصل مزاج داستانِ عشق کا بیان ہے۔ چوں کہ مثنوی کی صنف میں شروع سے ہی عام موضوعات سے کچھ زیادہ داستان کا عنصر شامل ہو گیا تھا، اس لیے واقعات اور بیانیہ کا استعمال اس کے اجزا میں بڑی اہمیت کا حامل ہو گیا مگر اس کے ساتھ ہی عشق کے جذبات و احساسات اور ان کی جزئیات کو بھی مثنوی کے اہم اجزا میں شامل تصور کیا جانے لگا۔ مثنوی کو بیانیہ شاعری کی معراج بھی کہا جاتا ہے جس میں ہر خارجی مظہر یا واقعاتی بیان، انسان کی داخلی کیفیات اور مربوط یا پے چیدہ جذبات کا عکس بن کر نمودار ہوتا ہے۔''
>
> (اردو شاعری کی کلاسیکی شعریات، مشمولہ، سہ ماہی فکر و تحقیق، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۷ء، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص: ۱۶،۱۵)

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

وزیر آغا نے اپنی تصنیف 'اردو شاعری کا مزاج' میں مثنوی کو محبت کی داستان بیان کرنے والی سب سے کارآمد صنفِ سخن قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مثنوی کا اصل مقصد محبت کی داستان کو بیان کرنا ہے۔ اگر مثنوی کو مختلف و متنوع خارجی موضوعات کے لیے برتا جائے یا عشقیہ داستان کے بیان میں محض واقعات کے بیان کو تمام تر اہمیت تفویض کردی جائے تو اس سے مثنوی کا اصل مزاج مجروح ہوتا ہے۔''

(وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص: ۳۱۸)

بعض ناقدین نے مثنوی کو داستانِ عشق کے بیان کے لیے خاص گردانا ہے اور یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ جس مثنوی میں داستانِ عشق کا بیان نہ ہو، وہ مثنوی نہیں کہی جاسکتی ہے۔ حالاں کہ یہ بات درست نہیں کہی جاسکتی کیوں کہ اردو مثنوی میں ابتدا سے ہی کسی خاص موضوع کی پابندی یا قید نہیں ہے۔ مشہور محقق گیان چند جین نے بھی مثنوی کی موضوعاتی تخصیص سے انکار کیا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میر تقی میر سے لے کر خواجہ الطاف حسین حالی تک کی تمام اہم ترین مثنویوں کا غالب موضوع عشق ہی ہے۔ غواصی کی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' ابن نشاطی کی 'پھول بن' ملا وجہی کی 'قطب مشتری' یا دکن کے دیگر شعرا کی مثنویاں اٹھا کر دیکھیے تو اس میں عشق و عاشقی کی داستان اور الفت و محبت کے جذبات سے پُر منظر نامے نظر آئیں گے۔ شمالی ہند کے شعرا نے بھی اس موضوع پر خوب مثنویاں لکھی ہیں۔ سودا، میر سوز، میر تقی میر، قائم چاند پوری، میر اثر، مومن، ذوق، رنگین، میر حسن، دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق لکھنوی وغیرہ کی مثنویاں عشقیہ بیانات و واقعات سے پُر ہیں۔

میر تقی میر اردو کے عظیم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے تیس سے زائد مثنویاں لکھی ہیں۔ ان کی نمائندہ مثنویوں کے موضوعات پر نظر ڈالیں تو عشق و محبت کے رنگ ہر طرف بکھرے نظر آئیں گے۔ 'شعلۂ عشق'، 'معاملاتِ عشق'، 'جوشِ عشق' اور 'دریائے عشق' جیسی ان کی اہم مثنویوں کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہی ہے۔ ان مثنویوں میں بہ طور عاشق شاعر کا کردار بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے میرؔ کی مثنویاں ان کی آپ بیتی بھی کہی جاتی ہیں۔ میر نے اپنی مثنوی 'دریائے عشق' کو نثر میں بھی تحریر کیا تھا۔ مصحفی نے میر کی اسی مثنوی کو از سرِ نو 'بحر المحبت' کے نام سے نظم کیا ہے۔ بعض محققین نے راسخ عظیم آبادی کی مثنویوں 'جذبِ عشق' اور 'کششِ عشق' میں میر تقی میر کی اسی مثنوی 'دریائے عشق' کے اجزا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان مثنویوں کا اگر بہ غور مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ کسی نے کسی کی مثنوی سے قصہ اخذ کیا تو کسی نے اپنی ذہانت و ذکاوت کو بروئے کار لاکر اس قصے میں مزید رنگ ڈال کر اسے وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔ دراصل عشق کا موضوع اردو مثنوی کو بہت راس آیا۔ اسی لیے شعرا نے اپنے اپنے ہنر کا جلوہ بکھیرنے کے لیے ایک ہی موضوع پر اپنے اپنے کارنامے دکھانے کی

کوشش کی۔

کلیات مومن میں طویل و مختصر بارہ مثنویاں ہیں۔ ان مثنویوں میں بیش تر مثنویاں عشقیہ قصوں اور جذبات سے لبریز ہیں۔ شکایت ستم، قصہ غم، قول غمیں، تف آتشیں، حنین مغموم اور آہ و زاری مظلوم؛ سب کی سب مثنویاں عشق و عاشقی کی داستان بیان کرتی ہیں۔ مومن کی مثنویوں کو ڈاکٹر گیان چند نے 'معاملاتِ عشق کی عمدہ شرح' کہا ہے۔ راسخ عظیم آبادی نے تقریباً ۱۷ مثنویاں لکھی ہیں جن میں زیادہ تر کے موضوعات حسن و عشق سے وابستہ ہیں۔ داغ دہلوی کی مثنوی 'فریادِ داغ' نہایت دل چسپ اور حسن و عشق کی واردات کا خوب صورت بیانیہ ہے۔ صفیر بلگرامی کی مثنوی 'فتنۂ عشق'، تسلیم سہسوانی کی مثنوی 'سعدین'، مظہر لکھنوی کی مثنوی 'ریاضِ عشق'، عروجؔ کی مثنوی 'عروجِ الفت' اور احسن لکھنوی کی مثنوی 'جذباتِ عشق' جیسی ان گنت مثنویاں ہیں جن میں حسن و عشق کا بیان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' پڑھیے تو عشقیہ قصے کی دل چسپیاں قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں۔ عشق و محبت سے لبریز وہ قصے جو داستانوں میں موجود تھے، میر حسن کے ذوق سخن کے زیر اثر آئے تو 'سحر البیان' جیسا عظیم کارنامہ وجود میں آیا۔ بدر منیر اور بے نظیر کی لازوال داستان عشق اس مثنوی کی پہچان بن گئی۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' بھی داستان عشق و محبت ہی کا بیان ہے۔ تاج الملوک اور گل بکاؤلی کے قصے کو دیا شنکر نسیم کی جادو بیانی نے شاہ کار بنا دیا ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو کی بیش تر مثنویوں میں عشقیہ مضامین کی بہتات ہے۔ اسی لیے مثنوی کی ایک اہم قسم 'عشقیہ مثنوی' کہی جاسکتی ہے۔ یہاں چند اہم مثنویوں کا ذکر کیا گیا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی ایسی مثنویاں ہیں جن کو عشقیہ مضامین کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔ ان ہی عشقیہ مثنویوں کو اخلاقی مثنویاں بھی کہا جاتا ہے۔

رزمیہ مثنویاں: اردو میں رزمیہ یا تاریخی و سوانحی مثنویاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ دکن کے بہت سے شاعروں سے رزمیہ مثنویاں منسوب ضرور ہیں تاہم کوئی بھی مثنوی کسی بڑے رزمیہ موضوع کو سمیٹی ہوئی نظر نہیں آتی۔ شعرا کے دربار سے انسلاک کے سبب چھوٹے چھوٹے واقعات کی عکس بندی ہو جاتی تھی یا بعض اوقات بادشاہِ وقت کی فرمائش پر کسی جنگ کے احوال رقم ہو جاتے تھے۔ اردو میں رزمیہ موضوعات پر جو بھی مثنویاں ملتی ہیں ان میں نصرتیؔ کی مثنوی 'علی نامہ' سر فہرست ہے۔ مولوی عبدالحق نے 'علی نامہ' کو عہد بیجاپور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نصرتی کا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑے احتیاط کے ساتھ برتا ہے۔ 'علی نامہ' کا ہیرو علی عادل شاہ ثانی شاہی ہے جو شجاعت و بہادری میں بے نظیر تھا۔ نصرتی نے جنگ کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کا ثبوت 'علی نامہ' میں منظوم جنگی مناظر، فتح و کامرانی کی

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

سرشاری، شکست وریخت سے دوچار فوجیوں کی پریشانی، بادشاہ کی انصاف پسندی، فیاضی وسخاوت اور رعایاپروری سے متعلق بیانات سے ملتا ہے۔ یہ مثنوی ہرلحاظ سے ہماری زبان کا ایک شاہ کار ہے۔ 'تاریخ اسکندری' بھی اس کی ایک اہم مثنوی ہے جوعہد سکندر عادل شاہ کی تاریخ ہے لیکن اس کا معیار وہ نہیں ہے جو 'علی نامہ' کا ہے۔

حفیظ جالندھری کا 'شاہ نامۂ اسلام' اسلامی تاریخ پر مشتمل طویل مثنوی ہے۔ رستمی کی لکھی ہوئی مثنوی 'خاورنامہ' کو بھی رزمیہ مثنویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عبدالغنی عبدل ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور کا شاعر ہے۔ اس کی مثنوی 'ابراہیم نامہ' میں ابراہیم عادل شاہ کی سوانح بیان کی گئی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس مثنوی کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کسی بادشاہ کی سوانح عمری منظوم کی گئی ہے۔ حسن شوقی کئی سلطنتوں سے وابستہ رہا۔ اس کی مثنوی 'فتح نامہ نظام شاہ' میں جنگ کے حالات تفصیل سے درج کیے گئے ہیں۔ 'فتح نامہ نظام شاہ' ایک رزمیہ مثنوی ہے جس میں دکن کے سلاطین اور وجیانگر کے حکمراں 'رام راج' کے درمیان ہونے والی ایک فیصلہ کن جنگ کی تفصیلات رقم ہیں۔ واجد علی شاہ کی مثنوی 'حزن اختر' کا شمار سوانحی اور تاریخی مثنویوں میں کیا جاتا ہے۔ اس میں واجد علی شاہ نے اپنی معزولی اور قید وبند کی ساعتوں کو منظوم کیا ہے۔ مشہور محقق گیان چند جین کے مطابق اس کی اہمیت ادبی سے زیادہ سوانحی اور تاریخی ہے۔ تاریخی مثنویوں میں امیر اللہ تسلیم کی مثنوی 'تاریخ رام پور' بھی اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ اس مثنوی کے تین حصے ہیں؛ تواریخ بدیع، تواریخ کامل، سفرنامۂ خسروی۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں رزمیہ، تاریخی اور سوانحی مثنویاں لکھی ضرور گئی ہیں لیکن ان میں 'علی نامہ' جیسا کوئی بڑا کارنامہ نظر نہیں آتا ہے۔

مثنوی کی متفرق اقسام: مثنوی کی مذکورہ قسموں کے علاوہ اس کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن وعشق، مذہب وتصوف، اخلاقی آداب واقدار، رزم، تاریخ اور سوانح کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی مثنویاں تحریر کی گئی ہیں۔ کلاسیکی شاعری میں ہجو کے موضوع کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ ہجو پر مبنی شاعری میں کسی شخص کی خامیوں، خرابیوں اور برائیوں کا بیان کیا جاتا ہے نیز ایسی منظومات میں زمانے کی زبوں حالی کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ اردو میں ہجو کے موضوع پر خاصی مثنویاں تحریر کی گئی ہیں۔ عظیم قصیدہ گو شاعر سودا نے کئی ہجویہ مثنویاں کہی ہیں جن میں 'پیل نربت سنگھ'، 'میر ضاحک'، 'امیر بخیل'، 'شیدی فولاد خاں کوتوال'، 'ہجو حکیم غوث' اور 'ہجو میاں فوقی' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ سودا کی طرح میر تقی میر نے بھی اچھی خاصی تعداد میں ہجویہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ان میں سات مثنویاں خاص اشخاص کے ہجو میں کہی گئی ہیں۔ میر حسن کی مثنویوں میں 'گلزار ارم' کا نام بھی شامل ہے۔ اس مثنوی میں میر حسن نے لکھنؤ کی ہجو کرتے ہوئے فیض آباد کی تعریف کے پل باندھے ہیں۔ ان مثنویوں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہجو کا موضوع بھی اردو مثنویوں میں خوب استعمال ہوا ہے اور کئی اہم 'ہجویہ مثنویاں' اردو شعری روایت کی یادگار ہیں۔ مثنوی کی ہیئت میں شکارنامے بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا نے آصف الدولہ کی شکاری مہموں کے حالات مثنوی کی ہیئت میں قلم بند کیے ہیں۔

انجمنِ پنجاب کا وجود عمل میں آنے کے بعد مثنوی کے موضوعات میں تبدیلی آئی اور تنوع پیدا ہوا۔ حب الوطنی اور وطن دوستی کے موضوع پر کئی مثنویاں تحریر کی گئیں۔ خود مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے اس موضوع پر اچھی مثنویاں لکھی ہیں۔ دونوں نے 'حب وطن' کے نام سے مثنوی لکھی اور حب الوطنی کے تعلق سے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اسماعیل میرٹھی کی 'کوہ ہمالہ'، 'بارش کا پہلا قطرہ' اور 'حب وطن' جیسی مثنویوں میں وطن سے محبت کی سرشاری نظر آتی ہے۔ شاد عظیم آبادی کی مثنوی 'مادرِ ہند' بھی اسی موضوع کی نمائندگی کرتی ہے۔ جاں نثار اختر کی مثنوی 'امن نامہ' بھی وطن دوستی کے موضوع کو بیان کرتی ہے۔

جدید مثنویوں میں فطرت کو بھی خوب نظم کیا گیا ہے۔ حالی کی 'برکھا رت' اس کی بڑی مثال ہے جس میں گرمی کے موسم کا نقشہ نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے بھی 'رات'، 'ہوا چلی' اور 'برسات' وغیرہ میں قدرت کے مناظر کو منظوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس عہد میں اقبال کی 'ساقی نامہ' جیسی مثنوی بھی لکھی گئی جس میں فلسفۂ خودی کی تشریح و تعبیر کی گئی ہے۔ جمیل مظہری نے فکری و فلسفیانہ مثنویاں لکھ کر جدید مثنوی کو نیا رنگ دیا ہے۔ علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی جیسے ترقی پسند شعرا نے سیاسی رنگ میں ڈوبی مثنویاں تحریر کیں۔ اس کے ساتھ ہی سماجی، اخلاقی، تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی موضوعات کو بھی جدید مثنوی میں نمایاں طور پر برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔

10.3 ماحصل

اردو کی بیش تر ابتدائی مثنویاں تصوف و مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے انھیں مذہبی یا متصوفانہ قسم کی مثنویاں کہا جاتا ہے۔ ان مثنویوں کو اخلاقی مثنویوں کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان مثنویوں کا موضوع تصوف، مذہبی تعلیمات اور انسانی و اخلاقی اقدار رہا ہے۔ مذہب و تصوف اردو مثنوی کا موضوع ضرور رہا ہے لیکن اردو مثنوی کو سب سے زیادہ عشقیہ موضوعات راس آئے۔ اردو کے بیش تر کلاسیکی شعرا نے اردو مثنویوں میں داستان عشق رقم کرنے کا عمل انجام دیا ہے۔ میر تقی میر سے لے کر خواجہ الطاف حسین حالی تک کی تمام اہم ترین مثنویوں کا غالب موضوع عشق ہی ہے۔ غواصی کی 'سیف الملوک و بدیع الجمال'، ابن نشاطی کی 'پھول بن'، ملا وجہی کی 'قطب مشتری' یا دکن کے دیگر شعرا کی مثنویاں اٹھا کر دیکھیے تو اس میں عشق و عاشقی کی داستان اور الفت و محبت کے جذبات سے پُر منظر نامے نظر آئیں گے۔ شمالی ہند کے شعرا نے بھی اس موضوع پر خوب مثنویاں لکھی ہیں۔ سودا، میر سوز، میر تقی میر، قائم چاند پوری، میر اثر، مومن، ذوق، رنگین، میر حسن، دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق لکھنوی وغیرہ کی مثنویاں عشقیہ بیانات و واقعات سے پُر ہیں۔ اردو میں رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ اردو کی رزمیہ مثنویوں میں نصرتی کی 'علی نامہ' سرفہرست ہے۔ مذہب و تصوف، اخلاقی آداب و اقدار، حسن و عشق، رزم، تاریخ اور سوانح کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی مثنویاں تحریر کی گئی ہیں۔ کلاسیکی شاعری میں ہجو کے موضوع کو نمایاں

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

حیثیت حاصل رہی ہے۔ کلاسیکی شعرا نے اردو میں ہجو کے موضوع پر خاصی مثنویاں تحریر کی ہیں۔

مثنوی کی ہیئت میں شکارنامے بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ انجمنِ پنجاب کا قیام عمل میں آنے کے بعد مثنوی کے موضوعات میں تبدیلی آئی اور تنوع پیدا ہوا۔ حب الوطنی اور وطن دوستی کے موضوع پر کئی مثنویاں تحریر کی گئیں۔ جدید مثنویوں میں فطرت کو بھی خوب نظم کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سماجی، اخلاقی، تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی موضوعات کو بھی جدید مثنوی میں نمایاں طور پر برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- مثنوی کے موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کو سمجھا۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنوی نگاروں سے واقفیت حاصل کی۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہی حاصل کی۔
- جدید دور میں مثنوی کے موضوعات میں جو بدلاؤ آیا، اس کے بارے میں جان کاری حاصل کی۔

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مثنوی کے موضوعات کے بارے میں اپنی معلومات درج کیجیے۔

۲۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مثنوی کی کتنی قسمیں بتائی ہیں؟

۳۔ ابتدا میں کس قسم کی مثنویاں زیادہ تحریر کی گئیں؟

۴۔ اردو میں زیادہ تر کس قسم کی مثنویاں تحریر کی گئیں۔

۵۔ اردو میں رزمیہ مثنویوں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

10.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مثنوی کے لیے موضوعات کی تخصیص نہیں ہے۔ شاعر جو موضوع چاہے، مثنوی کی ہیئت میں نظم کر سکتا ہے۔ بیانیہ حکایتیں، تصوف و اخلاقیات، عقائد و کلام، تفسیر و فقہ، ہجو و مدح، طنز و مزاح، سیاست و صحافت، مکتوب و آپ بیتی، علوم و فنون، ساقی نامہ، بارہ ماسہ، عشق و عاشقی کی داستان، پریوں، دیوزادوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے دل فریب قصے، رسم و رواج یہاں تک کہ نحو و صرف کی مثالیں اور

بچوں کا ادب، ایسا کون سا موضوع ہے جسے مثنوی کی ہیئت میں نظم نہیں کیا گیا ہو۔ مذہبی واقعات، پند ونصائح، داستان حسن ومحبت، میدان جنگ کی معرکہ خیزی، بزمِ طرب کی دل آویزی، رسوماتِ شادی وبیاہ، حیرت انگیز مافوق الفطری کارنامے اور تاریخ کے علاوہ شہرِ آشوب سبھی کچھ مثنویوں کا موضوع ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کے مضامین میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ اردو میں مثنوی کو عشقیہ موضوعات زیادہ راس آئے اور شعرائے اردو نے اس موضوع پر لازوال تخلیقات پیش کیں۔

۲۔ اردو کے اہم نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' میں مقامی موضوعات کے اعتبار سے مثنوی کو چھے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔(۱) مذہبی مثنویاں (۲) تاریخی مثنویاں (۳) معاشرتی کوائف وآثار سے متعلق مثنویاں (۴) فطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں مثنویاں (۵) حب الوطنی سے متعلق مثنویاں (۶) ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں۔

۳۔ اردو کی بیش تر ابتدائی مثنویاں مذہبی اور متصوفانہ قسم کی ہیں۔ان مثنویوں کا موضوع تصوف اور مذہبی تعلیمات واقدار رہا ہے۔ابتدائی نمونوں کے تعلق سے عبدالسلام ندوی نے قطب شاہ کی ایک نعتیہ مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ محققین کی رائے ہے کہ مثنوی کے جو قدیم ترین نمونے ملتے ہیں، وہ بابا شیخ فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔بعض محققین نے حضرت امیر خسرو کے کلام کے بعض حصوں کو مثنوی کے اولین نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔کچھ لوگوں نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ بہاؤالدین برناوی اور سید ہاشم حسینی علوی کے ملفوظات میں مثنوی کے ابتدائی نقوش کی نشان دہی کی ہے۔ان تمام ابتدائی نمونوں کا نمایاں موضوع تصوف اور مذہب ہے۔

۴۔ اردو میں زیادہ تر عشقیہ مثنویاں تحریر کی گئیں۔اردو کے بیش تر کلاسیکی شعرا نے اردو مثنویوں میں داستان عشق رقم کرنے کا عمل انجام دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ علمائے ادب نے اسے مثنوی کا بنیادی موضوع اور عشقیہ مثنوی کو مثنوی کی اہم قسم قرار دیا ہے۔ان عشقیہ مثنویوں کو داستانوی مثنویوں کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔اردو مثنویوں میں داستان طرازی کا انداز واسلوب مختلف ضرور رہا ہے لیکن چاہے طبع زاد مثنویاں ہوں یا پھر کسی دوسری زبان سے ترجمہ شدہ ہوں، ان سب کے قصوں کا مرکزی نکتہ عشق ہی رہا ہے۔

۵۔ اردو میں رزمیہ یا تاریخی وسوانحی مثنویاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔دکن کے بہت سے شاعروں سے رزمیہ مثنویاں منسوب ضرور ہیں تاہم کوئی بھی مثنوی کسی بڑے رزمیہ موضوع کو سمیٹی ہوئی نظر نہیں آتی۔شعرا کے دربار سے انسلاک کے سبب چھوٹے چھوٹے واقعات کی عکس بندی ہوجاتی تھی یا بعض اوقات

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

بادشاہِ وقت کی فرمائش پر کسی جنگ کے احوال رقم ہو جاتے تھے۔ اردو میں رزمیہ موضوعات پر جو بھی مثنویاں ملتی ہیں ان میں نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' سرفہرست ہے۔ مولوی عبدالحق نے 'علی نامہ' کو عہد بیجاپور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نصرتی کا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑے احتیاط کے ساتھ برتا ہے۔ 'علی نامہ' کا ہیرو علی عادل شاہ ثانی شاہی ہے جو شجاعت و بہادری میں بے نظیر تھا۔ نصرتی نے جنگ کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کا ثبوت 'علی نامہ' میں منظوم جنگی مناظر، فتح و کامرانی کی سرشاری، شکست و ریخت سے دوچار فوجیوں کی پریشانی، بادشاہ کی انصاف پسندی، فیاضی و سخاوت اور رعایا پروری سے متعلق بیانات سے ملتا ہے۔ یہ مثنوی ہر لحاظ سے ہماری زبان کا ایک شاہ کار ہے۔ اردو کی دیگر رزمیہ مثنویوں میں نصرتی کی 'تاریخ اسکندری' رستمی کی 'خاور نامہ' عبدالغنی عبدل کی 'ابراہیم نامہ' اور حسن شوقی کی 'فتح نامہ نظام شاہ' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

10.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معنی)
طرب	خوشی، انبساط
شہرِ آشوب	آشوب کے لغوی معنی ہیں 'بربادی، بگاڑ یا فتنہ وفساد'۔ شاعری کی اصطلاح میں شہرِ آشوب ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر کی پریشانی، گردشِ آسمانی اور زمانے کی ناقدری کا بیان ہو
بارہ ماسہ	وہ نظم جس میں بیوی اپنے شوہر کی جدائی میں ہر مہینے اپنے دل پر گزرنے والی کیفیات کا اظہار کرتی ہے
رزمیہ	وہ داستان جس میں جنگ کے حالات و واقعات قلم بند کیے گئے ہوں
ہجو	برائی کرنا، بدگوئی کرنا، شاعری کی اصطلاح میں جو نظم کسی کی مذمت یا برائی بیان کرنے کے لیے لکھی جائے، ہجو یا ہجویہ کہلاتی ہے۔
شکارنامہ	وہ منظوم یا منثور تحریر جس میں شکار کی کسی مہم کے حالات رقم کیے جائیں
اسرار	بھید، راز
مربوط	منسلک، جڑا ہوا
متنوع	گونا گوں، قسم قسم کا
تفویض	سپردگی، حوالگی، تحویل

مکارم	خوبیاں، قابل تعریف کام
رموز	ایما، اشارہ
معراج	بلندی، اعلیٰ درجہ
مظہر	ظاہر، ظاہر ہونے کی جگہیں
آب وتاب	چمک دمک، آرائش، زیبائش
تخصیص	خصوصیت، خاص کرنا
تعبیر	تشریح، توضیح
لبریز	بھرا ہوا، پُر، لبالب
معرکہ خیز	ہنگامہ برپا کرنے والا، دھوم مچانے والا، زبردست

10.8 کتب برائے مطالعہ

۱	اردو مثنوی شمالی ہند میں	:	گیان چند جین
۲	مثنوی نگاری	:	علی جواد زیدی
۳	اردو مثنوی کا ارتقا	:	عبدالقادر سروری
۴	اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں)	:	سید محمد عقیل رضوی
۵	جدید اردو مثنوی: فن اور فکری ابعاد	:	ظفر انصاری ظفرؔ

اکائی 11 دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا

ساخت

11.1 اغراض و مقاصد

11.2 تمہید

11.3 دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا

11.3.1 مثنوی کا پس منظر

11.3.2 بہمنی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا

11.3.3 عادل شاہی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا

11.3.4 قطب شاہی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا

11.3.5 ماحصل

11.4 آپ نے کیا سیکھا؟

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

11.6 سوالوں کے جوابات

11.7 فرہنگ

11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- مثنوی کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔
- بہمنی دور میں اردو مثنوی کے ارتقا سے متعارف ہوں گے۔
- عادل شاہی دور میں اردو مثنوی کے ارتقا کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- قطب شاہی دور میں اردو مثنوی کے ارتقا سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- دکنی مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

11.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ مثنوی کی تعریف، اجزاے ترکیبی، فنی خصوصیات اور اس کی اقسام سے واقف ہوئے۔ مثنوی کلاسیکی شاعری کی مقبول صنف ہے۔ دکن میں اس کا آغاز وارتقا ہوا۔ دکن میں اردو مثنوی نگاری کی مضبوط اور روشن روایت رہی ہے۔ اس اکائی میں آپ مثنوی کے پس منظر، دکن میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں اردو مثنوی کے ارتقا سے واقف ہوں گے اور دکنی مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

11.3 دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا

11.3.1 مثنوی کا پس منظر

مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عربی شاعری میں اس صنف کا رواج نہیں رہا ہے۔ عربوں میں 'رجز' نام کی شعری صنف ضرور تھی جسے بعض علماے ادب نے مثنوی سے مشابہ قرار دیا ہے۔ 'مثنوی' کا نام اہلِ ایران کا ایجاد کردہ ہے۔ اہلِ عرب نے اسے 'مزدوجہ' کا نام دیا ہے۔ صنفِ مثنوی کی موجودہ شکل نے ایران میں جنم لیا۔ فارسی زبان سے یہ صنف اردو میں آئی۔ اردو والوں نے اس کا نام اسی طرح برقرار رکھا لیکن اردو کے شاعروں نے اپنی ہنرمندی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے بل پر اسے اردو کی اپنی چیز بنا ڈالا۔ فارسی کے مشہور شاعر رودکی کو پہلا مثنوی نگار قرار دیا گیا ہے کیوں کہ انھوں نے عربی کے مشہور فن پارے 'کلیلہ دمنہ' کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ بعض اہلِ علم نے ابوشکور بلخی کو مثنوی کا موجد مانا ہے جن کے کلام کا ایک ٹکڑا مثنوی کی شکل میں دستیاب ہے اور غالباً کسی طویل مثنوی کا حصہ ہے۔ مثنوی نگاری میں اولیت کی بحث سے قطع نظر، اس بات پر تقریباً سبھی ناقدین ادب کا اتفاق ہے کہ فردوسی کا 'شاہنامہ' پہلی مکمل مثنوی ہے۔ اسے دقیقی نے شروع کیا اور فردوسی نے تکمیل کو پہنچایا تھا۔ اس لیے گرچہ رودکی کو پہلا مثنوی نگار شاعر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن مثنوی نگاری کے باضابطہ آغاز کا سہرا فردوسی کے 'شاہنامہ' کے سر جاتا ہے۔ اردو میں مثنوی کے جو قدیم ترین نمونے دستیاب ہیں، وہ حضرت بابا فرید گنج شکر اور دیگر صوفیاے کرام سے منسوب ہیں۔ اس ضمن میں قطبنؒ، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شاہ میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اردو مثنوی کے فروغ میں دکن کا اہم کردار رہا ہے اور دکن میں اس کی ایک مضبوط روایت رہی ہے۔

11.3.2 بہمنی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا

مثنوی اردو شاعری کی قدیم اور مقبول صنف ہے جسے مشہور محقق گیان چند جین نے اردو میں بیانیہ شاعری کی

معراج قرار دیا ہے۔ فارسی شاعری سے اردو میں آنے والی اس صنف نے خوب خوب ترقی کی۔ اردو کے عظیم شعرا نے صنفِ مثنوی میں خوب طبع آزمائی کی اور کمال کے جوہر دکھائے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی اردو ادب کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں جب اہم ترین شعرا کا ذکر ہوتا ہے تو ان کی مثنویوں کے تذکرے کے بغیر بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ اردو میں قصہ گوئی اور اسالیب کے ارتقائی سفر کا جائزہ مثنوی کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ غزل کے بعد شعرا نے مثنوی میں سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں داستانِ حیات بیان کرنے کے بہت سے امکانات موجود ہیں۔ شاعر انسانی سماج و معاشرے کی تمام تر صورت حال کی عکاسی اس فن میں بہ آسانی کرسکتا ہے۔ شاعر انسانی زندگی اور اس کی تہذیب وثقافت کی داستان کو جس خوبی سے اس میں پیش کرسکتا ہے، کسی اور صنف میں نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اصنافِ شاعری میں مثنوی کو بے پناہ مقبولیت حاصل رہی ہے۔ مثنویوں کے ذریعے اس دور کے ادبا و شعرا کی ذہنی و سماجی کیفیات اور سماجی صورت حال کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس صنف کی اہمیت و افادیت، مقبولیت اور وسعت موضوع و بیان کی وجہ سے اردو کے تقریباً بیش تر کلاسیکی غزل گو شعرا نے مثنویاں کہی ہیں۔ دکن کے شعرا نے بھی اس صنف میں اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کے زیادہ تر شعرا اپنی شناخت مثنویوں کی وجہ سے ہی رکھتے ہیں۔

دکن میں اردو مثنوی کی روایت کو بہ آسانی سمجھنے کے لیے اسے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؛ بہمنی دور، عادل شاہی دور، قطب شاہی دور۔ مشہور محققین عبدالقادر سروری، نصیرالدین ہاشمی اور ڈاکٹر جمیل جالبی وغیرہ کے مطابق اردو مثنوی کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے۔ نصیرالدین ہاشمی اپنی کتاب 'دکن میں اردو' میں رقم طراز ہیں:

> ''جہاں تک تحقیق کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی زبان میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلی بنیاد رکھی گئی ہے۔''
>
> (نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص: ۴۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فخر دین نظامی کی مثنوی کو اردو کی پہلی مثنوی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اردو زبان کی پہلی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' ہے جس کے مصنف فخر دین نظامی ہیں۔''
>
> (جمیل جالبی، تاریخِ ادب اردو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص: ۴۰۰)

نظامی بیدری کا تعلق بہمنی دور سے ہے۔ دکن میں بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ سے ۱۵۲۷ء تک قائم رہی۔ ابتدا میں اس سلطنت کا پایۂ تخت گلبرگہ رہا اور بعد میں اسے بیدر منتقل کر دیا گیا۔ بہمنی سلطنت کے بیش تر حکمرانوں نے شعرو ادب کی تخلیق اور اس کے فروغ کے لیے انتہائی سازگار ماحول فراہم کیا۔ بہمنی دور کے معاشرتی اور تہذیبی ماحول میں فنون لطیفہ خصوصاً شعروادب کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ اردو کی پہلی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' اسی عہد کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق بہمنی دور کے نویں حکمراں شہاب الدین احمد شاہ ولی بہمنی کے دور میں نظامی بیدری نے یہ مثنوی لکھی تھی۔ نصیر الدین ہاشمی نے نظامی بیدری سے متعلق لکھا ہے کہ وہ 'سلطان کا درباری شاعر' تھا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نظامی بیدری کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''موجودہ معلومات کے لحاظ سے (نظامی) اردو کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے حسن و عاشقی کے موضوع پر ایک طویل مثنوی 'پدم راؤ' لکھی، ورنہ اس سے قبل جو اردو نظم ونثر ملتی ہے وہ بالعموم مذہبی اور صوفیانہ موضوعوں سے متعلق ہے۔'' (محی الدین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۱۹۹۴ء، ص:۱۴)

مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' میں جو قصہ بیان ہوا ہے، وہ مقامی روایات و اعتقادات سے وابستہ ہے۔ اس کا قصہ کدم راؤ اور پدم راؤ دو کرداروں پر مشتمل ہے۔ کدم راؤ راجا ہے اور پدم راؤ اس کا وزیر جو کہ ایک ناگ ہے۔ اس کے سلسلے میں بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اس کا مرکزی تصور ہندی افسانوی ادب سے متاثر ہے۔ اس مثنوی میں سنسکرت دیومالا کی چھاپ کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے کئی عقائد کا بیان ملتا ہے۔ بادشاہ کا وزیر ایک ناگ سانپ کا ہونا، کستوری اور مشک یا صندل پیشانی پر لگانا، جوگیوں سے علم حاصل کرنا یا پھر تبدیلیٔ قالب کا تصور اسی تہذیبی روایت کا امین ہے جو ہندوستان کی مٹی میں صدیوں سے زیست کرتی ہے۔

میراں جی شمس العشاق بہمنی دور کے مشہور صوفی گزرے ہیں۔ ان کی کتابوں میں اسرار و معرفت کو خاص جگہ دی گئی ہے۔ ان کی تخلیقات میں صوفیانہ خیالات ہندوستانی قالب میں ڈھال کر پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی تصنیف 'خوش نامہ' مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ اسے ابتدائی دور کی مثنویوں میں شمار کیا جاتا ہے جس میں مذہبی و متصوفانہ موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۷۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ 'خوش نغز' اور 'شہادۃ الحقیقت' نامی مثنویاں بھی انھیں سے منسوب ہیں۔ ان مثنویوں میں بھی تصوف، عرفان روح، عرفان ذات، عقل وعشق، شریعت وطریقت اور دین کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔

اشرف بیابانی کو بہمنی دور کے شعرا میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ 'نوسرہار' اور 'واحد باری' ان سے منسوب مشہور مثنویاں ہیں۔ ان مثنویوں کا موضوع مذہب ہے۔ ان کی ایک مثنوی کا نام 'لازم المبتدی' ہے جس میں مرد اور عورت سے متعلق شرعی احکامات بیان کیے گئے ہیں۔ مثنوی 'واحد باری' امیر خسرو کی 'خالق باری' کے طرز پر لکھی گئی

تخلیق ہے۔ 'نوسر ہار' ان کی سب سے اہم مثنوی ہے جس میں واقعات کربلا کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں تقریباً اٹھارہ سو اشعار ہیں۔ دکن کی مثنویوں میں 'نوسر ہار' کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مذہب اور عشق کا خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس مثنوی میں رزمیہ عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔

بہمنی دور میں اردو شعر و ادب کو فروغ دینے والوں میں بہت سے صوفیا اور شعرا کے نام ملتے ہیں۔ مشتاق، لطفی، اشرف، نظامی اور سید محمد حسینی گیسودراز وغیرہ کو اس عہد کے نمائندہ شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ البتہ مثنوی کے تناظر میں نظامی بیدری، میراں جی شمس العشاق اور اشرف بیابانی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ نئی سلطنتیں؛ عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور عماد شاہی قائم ہوئیں۔ ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں اردو شعر و ادب بالخصوص مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔

11.3.3 عادل شاہی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا

عادل شاہی سلطنت کا قیام ۱۴۹۰ء میں ہوا۔ بہمنی دور کے مشہور وزیر محمود گاواں کے قتل کے بعد اس کے تربیت یافتہ سلطان یوسف عادل شاہ نے بہمنی سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بیجاپور کے علاقے میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر کے عادل شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔ لگ بھگ دو صدی کے عرصے تک یہ حکومت قائم رہی۔ اس عہد میں علم و ادب، شعر و شاعری، خصوصاً صنفِ مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ اس دور کے مشہور مثنوی نگاروں میں عبدلؔ، برہان الدین جانمؔ، مقیمیؔ، حسن شوقیؔ، علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ، نصرتیؔ، ہاشمیؔ، رستمیؔ اور ملک خوشنود وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

عادل شاہی عہد کا ایک اہم شاعر عبدالغنی عبدلؔ ہے جس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مدح میں 'ابراہیم نامہ' نامی تاریخی مثنوی تحریر کی۔ اس میں بادشاہِ وقت کی سوانح اور عہد و معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔ عبدل نے اس مثنوی میں بادشاہ وقت، اس کے شہر، اس کے دربار، محل، شوق و شکار، لشکر، باغ اور میزبانی کی تعریف میں ابواب قائم کیے ہیں۔ مسعود حسین خاں نے اسے مثنوی کی ہیئت میں طویل قصیدہ قرار دیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس مثنوی کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کسی بادشاہ کی سوانح عمری بیان کی گئی ہے۔ ناقدین ادب نے اس کی تاریخی اہمیت اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے عبدلؔ کی دل چسپی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسے دکنی زبان کی تشکیل میں اہم قرار دیا گیا ہے۔

میراں جی کے فرزند برہان الدین جانم عادل شاہی دور کے اہم صوفی بزرگ تھے۔ ان کی تحریروں میں تصوف و سلوک، رشد و ہدایت اور پند و نصیحت جیسے نکات ملتے ہیں۔ 'ارشاد نامہ'، 'حجت البقا'، 'وصیت الہادی'، 'بشارت الذکر' اور 'منفعت الایمان' وغیرہ مثنویاں انھیں کے نام سے منسوب ہیں۔ 'ارشاد نامہ' ان کی طویل مثنوی ہے جس

میں تصوف کے نکات پیش کیے گئے ہیں۔ جانم کی مثنویوں کا موضوع اگرچہ تصوف ہے مگر ان کے یہاں مقامی عناصر و اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں شیو جی سے عقیدت بھی ہے اور کرشن جی کے عشق میں تڑپتی گوپیوں کا بیان بھی ہے۔

مقیمی کا شمار عادل شاہی عہد کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کی مثنوی 'چندر بدن ومہیار' اردو کی اہم مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس مثنوی کا ماخذ شہر سندر پٹن کی شہزادی چندر بدن سے متعلق ایک معروف قصہ ہے۔ چندر بدن خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ ایک میلے میں مہیار نامی ایک مسلمان سوداگر اس پر عاشق ہوجاتا ہے۔ ان ہی دونوں کے عشق کی داستان کو مقیمی نے اپنی اس مثنوی میں نظم کیا ہے۔ اس مثنوی میں مافوق الفطرت کرداروں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مقیمی کی ایک مثنوی 'فتح نامہ' بھی ہے۔ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے جس میں سلطان محمد عادل شاہ اور راجا ایر بھدر کے درمیان ہوئی جنگ کی کہانی پیش کی گئی ہے۔

عادل شاہی عہد کے شعرا میں ایک اہم نام حسن شوقی کا ہے۔ وہ کئی سلطنتوں سے وابستہ رہا۔ اس کی مثنوی 'فتح نامہٗ نظام شاہ' اور 'میز بانی نامہ' کا شمار اردو کی مشہور رزمیہ اور سوانحی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ 'فتح نامہٗ نظام شاہ' میں دکن کے سلاطین اور وجیانگر کے حکمراں 'آلیہ رام رائے' کے درمیان ہونے والی ایک فیصلہ کن جنگ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس مثنوی کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ اس میں مستند واقعات کے ساتھ ساتھ اس وقت کی تہذیب و معاشرت کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی صرف سلطان ہی نہیں، بلکہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا جس کی توجہ اور محنت سے بیجاپور کی فضا میں شعر و شاعری کا خوب رنگ جما۔ شاہی نے دوسری اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ساتھ مثنویاں بھی کہیں۔ اس کے کلیات میں تین مثنویاں ملتی ہیں۔ پہلی مثنوی کا تعلق حضرت علی کے فتح خیبر کے واقعے سے ہے جس کا نام 'خیبر نامہ' ہے۔ یہ ایک مختصر مثنوی ہے جس میں ۲۷ ابیات ہیں۔ مرتب کلیات شاہی نے لکھا ہے کہ روانی، سلاست اور خوش اعتقادی کے سوا اس مثنوی میں کوئی خاص بات نہیں۔ شاہی کی باقی دو مثنویوں میں صرف سات سات شعر ہیں۔ ان دونوں مثنویوں میں سنسکرت شعریات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ پہلی مثنوی میں محبوبہ کے سراپا کو آسمان، رات، چاند اور چکر بان وغیرہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا نام 'دکھائی گگن کا تماشا لگا' ہے۔ جب کہ دوسری مثنوی میں ایک ایسی محبوبہ کی تصویر پیش کی گئی ہے جو سرتا پیر سونے کے زیورات سے آراستہ کی گئی ہے۔ شاہی نے اس کے اعضا و جوارح اور ناز و ادا کی مرقع کشی کی ہے۔ اس مثنوی کا نام 'ایک محبوبہ' ہے۔

عادل شاہی دور میں نصرتی کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ بادشاہ کے دربار میں اس کی بڑی عزت تھی۔ 'گلشن عشق' اس کی انتہائی مشہور مثنوی ہے جس کا شمار اردو کی چند بڑی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اس مثنوی کے مرکزی قصے کی بنیاد قدیم لوک کہانی پر ہے۔ اس میں کنور منوہر اور مدھ مالتی کی داستان عشق بیان کی گئی ہے جو

قدیم زبانی بیانیہ کا حصہ رہی ہے۔ فارسی میں بھی اس قصے کو کئی شاعروں نے نظم کیا ہے۔ ناقدین فن وادب نے اس مثنوی کی فنی وادبی خوبیوں کو تسلیم کیا ہے۔ اس مثنوی کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ اس مثنوی کا ہندوستانی رنگ وآہنگ اپنی جانب کھینچتا ہے۔

نصرتی کی دوسری اہم ترین مثنوی 'علی نامہ' ہے۔ اردو کی رزمیہ مثنویوں میں 'علی نامہ' سرفہرست ہے۔ اس مثنوی میں بیجاپور پر مغلوں اور شیواجی کی قیادت والے مرہٹوں کی رسہ کشی کی داستان، بادشاہ وقت علی عادل شاہ کی میدان جنگ میں بذات خود آمد، فوجی قیادت، راجہ بدنور کی سرکوبی اور مغل فوجی سربراہ جے سنگھ کو پسپا کرنے کی مہمات کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے 'علی نامہ' کو عہد بیجاپور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ 'تاریخ اسکندری' بھی اس کی ایک اہم مثنوی ہے جو عہد سکندر عادل شاہ کی تاریخ ہے۔ یہ نصرتی کے اس دور کا کلام ہے جب بیجاپور کی سلطنت انحطاط کا شکار تھی۔ سکندر عادل شاہ کی فوجی مہمات کے احوال اس مثنوی کا حصہ ہیں۔

ہاشمی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' بھی عادل شاہی دور کی یادگار ہے۔ ہاشمی ریختی کا صاحب دیوان شاعر ہے جو نابینا تھا۔ اس کی مذکورہ مثنوی پانچ ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے جس کو غیر معمولی کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ محققین نے یوسف زلیخا کے موضوع پر لکھی گئی مثنویوں میں فنی خوبیوں کی بنیاد پر اس مثنوی کو بہت اہمیت دی ہے۔

کمال خاں رستمی عادل شاہی دور کا مشہور شاعر ہے۔ اس نے ایک طویل مثنوی 'خاور نامہ' تحریر کی ہے۔ اسے رزمیہ مثنویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ فارسی خاورنامہ کا ترجمہ ہے۔ چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل یہ ایک اہم رزمیہ مثنوی ہے جس میں حضرت علی کی جنگوں کا تذکرہ ہے لیکن اس میں بیان کردہ واقعات کا کوئی تاریخی استناد نہیں ہے بلکہ سبھی قصے فرضی اور من گھڑت ہیں۔ اسے بعض محققین نے دکن کی بہترین مثنوی قرار دیا ہے۔ ترجمہ ہونے کے باوجود بھی قصوں کا ربط وتسلسل کمال کا ہے۔

ملک خوشنود بنیادی طور پر گول کنڈہ کا باشندہ تھا اور عبداللہ قطب شاہ کی بیٹی خدیجہ کے جہیز میں بہ حیثیت غلام بیجاپور آیا تھا۔ اس کی شاعرانہ صلاحیتیں کمال کی تھیں جس کے سبب وہ جلد ہی عادل شاہی سلطنت کے نمائندہ شعرا میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے دو مثنویاں؛ 'یوسف زلیخا' اور 'جنت سنگار' تحریر کیں۔ مثنوی 'جنت سنگار' میں بہرام اور گور کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ یہ مثنوی امیر خسرو کی مثنوی 'ہشت بہشت' کا ترجمہ ہے۔ عادل شاہی عہد میں دیگر کئی اہم مثنویاں لکھی گئیں۔ اسی عہد میں امینؔ نامی شاعر گزرا ہے جس کی مثنوی 'بہرام و حسن بانو' کافی مشہور ہے جس میں عشقیہ قصے کو بیان کیا گیا ہے۔ امینؔ نے ہندوستانی روایت واساطیر کا اثر قبول کرتے ہوئے بہرام کو ایسے کردار کے روپ میں پیش کیا ہے جس میں کرشن جی کی جھلک نظر آتی ہے۔ محمد ابراہیم خان صنعتی بھی بیجاپور کا نام ور شاعر ہے۔ 'قصۂ بے نظیر یا قصۂ تمیم انصاری' اور 'گلدستہ' اس کی دو اہم مثنویاں ہیں

جن میں حضرت تمیم انصاری اور نبی کریم ﷺ سے متعلق واقعات کو نظم کیا گیا ہے۔ مختار عادل شاہی دور کا شاعر ہے جس نے تین ہزار اشعار پر مشتمل 'معراج نامہ' تحریر کیا ہے جس میں نبی کے واقعۂ معراج کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کی ایک مثنوی 'نور نامہ' بھی مذہبی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ ایاغی کی مثنوی 'نجات نامہ' میں دین اسلام کے فرائض واحکام پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ وہ مشہور مثنوی نگار شعرا ہیں جن کا تعلق عادل شاہی عہد سے ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی دیگر شعرا ہیں جنھوں نے عادل شاہی عہد میں شعر وادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

11.3.4 قطب شاہی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا

قطب شاہی سلطنت کی بنیاد سلطان قلی قطب الملک نے ۱۵۱۲ء میں رکھی اور تقریباً ۱۶۸۷ء تک یہ سلطنت قائم رہی۔ اورنگ زیب نے ۱۶۸۷ء میں اسے فتح کرکے وہاں مغل راج قائم کیا۔ قطب شاہی سلطنت کے بادشاہوں کو علم وادب سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ ہنرمندوں اور تخلیقی صلاحیت کے مالک ادبا وشعرا کی سرپرستی اور قدر کرتے تھے۔ اسی لیے قطب شاہی دورِ حکومت میں مختلف علوم وفنون نے خوب ترقی کی۔ قطب شاہی عہد میں شعر وشاعری بالخصوص اردو مثنوی نے نئی اونچائیاں حاصل کیں۔ ملا وجہی، ابن نشاطی، غواصی اور بحری وغیرہ اس عہد کے نمائندہ مثنوی نگار شعرا ہیں۔

قطب شاہی عہد میں بہ طور مثنوی نگار سب سے پہلا نام شیخ احمد شریف گجراتی کا آتا ہے۔ انھیں محمد قلی قطب شاہ نے اپنے دربار میں انتہائی عزت واکرام سے نوازا تھا۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران ہی شیخ احمد شریف گجراتی نے مشہور رومانوی داستان 'قصہ یوسف زلیخا' کو مثنوی کی شکل میں پیش کیا تھا۔ یہ مثنوی دراصل مولانا جامی کی فارسی مثنوی 'یوسف زلیخا' کا دکنی ترجمہ ہے۔ احمد گجراتی نے قلی قطب شاہ کی فرمائش پر ایک اور مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' تحریر کی جس میں لیلیٰ مجنوں کے روایتی قصے کو پیش کیا گیا ہے۔

قطب شاہی عہد کے دوسرے اہم ترین مثنوی نگار کا نام اسداللہ وجہی ہے۔ شعر وادب کی دنیا میں اسے 'ملا وجہی' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق قلی قطب شاہ کے دربار سے تھا۔ اس نے ۱۶۰۹ء میں ایک مثنوی 'قطب مشتری' تحریر کی جس میں محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستانِ محبت کے فرضی قصے کو پیش کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کا مرکزی کردار قلی قطب شاہ ہے۔ یہ مثنوی کئی اعتبار سے اردو کی چند بہترین مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ منظر نگاری اور سراپا نگاری کی عمدہ مثالیں اس مثنوی میں موجود ہیں۔ اس مثنوی میں قطب شاہی عہد کی تصویریں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

غواصی کا شمار قطب شاہی عہد کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کی تین مثنویاں؛ 'مینا ستونتی'، 'سیف الملوک وبدیع

الجمال' اور 'طوطی نامہ' اردو شعر و ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔ غواصی کی مثنوی 'مینا ستونتی' معروف بہ 'چندا اور لورک' قدیم قصے سے ماخوذ ہے۔ اس کی بنیاد ایک لوک کہانی ہے جس میں مینا نامی عورت کے باعصمت رہنے کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس قصے کو کئی شعرا نے نظم کیا ہے تاہم غواصی کے قصے کی بنیاد فارسی قصے پر ہے۔ غواصی کے پورے قصے پر ہندی لوک کتھاؤں کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کی مثنوی 'طوطی نامہ' میں جو قصہ بیان ہوا ہے، اس کے تعلق سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ 'طوطی نامہ' میں جو قصے بیان کیے گئے ہیں، ان کا تعلق ایک سنسکرت کتاب 'شک سپ تتی' سے ہے جس کے معنی ہیں؛ توتے کی زبانی بیان کردہ ستّر (۷۰) کہانیاں۔ اس مثنوی میں غواصی نے اپنے تخیل کا سہارا لے کر قصے کو اپنا رنگ پہنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس مثنوی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:

> ''غواصی نے 'طوطی نامہ' کا بنیادی قصہ نخشبی سے لیا ہے لیکن اس میں کہیں کہیں حسب ضرورت تصرفات بھی کر دیے ہیں۔ خصوصاً مثنوی کا ابتدائی اور آخری حصہ غواصی کے زورِ تخیل کا پتا دیتا ہے۔ نخشبی نے سنسکرت کی ستّر کہانیوں میں سے صرف ۵۲ کو فارسی میں ترجمہ کیا تھا... غواصی نے نخشبی کی ان باون کہانیوں میں سے فقط ۴۵ کو اپنی مثنوی میں بیان کیا ہے۔''
>
> (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص: ۸۴)

غواصی کی اہم ترین مثنوی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' ایک عشقیہ مثنوی ہے اور الف لیلہ کی نثری داستان سے ماخوذ ہے۔ یہ غواصی کی شاہ کار مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں محبوب کی تلاش کا سفر انتہائی دل چسپ ہے۔ اس سفر میں مافوق الفطرت مظاہر و مناظر کی بہتات ہے۔

ابن نشاطی قطب شاہی دور کا اہم مثنوی نگار ہے۔ اس کی مثنوی 'پھول بن' اردو کی چند نمایاں مثنویوں میں سے ایک ہے۔ 'پھول بن' احمد حسن دبیر کی ایک فارسی مثنوی 'بساتین الانس' سے ماخوذ ہے جس کا ذکر مثنوی نگار نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ اس قصے میں الف لیلیٰ کی کہانیوں، ہندوستانی اور ایرانی قصوں کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ اس کے کردار مصری اور ایرانی ہیں لیکن ان کی خصلتیں ہندوستانی ہیں۔ شکل و صورت سے لے کر ان کے طرزِ زندگی پر ہندوستانی چھاپ ہے۔

قطب شاہی عہد میں ایک شاعر قاضی محمود بحرؔی بھی گزرا ہے۔ اس کی مثنویاں 'من لگن' اور 'بنگاب نامہ' مشہور ہیں۔ 'من لگن' میں تصوف کے مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ اس مثنوی کی زبان و بیان دل کش ہے۔ اس کی دوسری مثنوی 'بنگاب نامہ' تہذیبی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ بنگاب سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی بھنگ کے

ہیں جس سے مراد شیوجی کو قوت فراہم کرنے والی بوٹی ہے۔ اس مثنوی میں بحریؔ نے بھنگ کے نشے میں خود کو خدا کے ساتھ ملا دینے کی بات کہی ہے۔ ہندو عقیدے میں بھگوان شیو کا معاملہ ایسا ہی ہے کہ وہ بھنگ کا شیون کرتے ہیں کیوں کہ اس کے نشے میں پرماتما کی قربت حاصل ہوتی ہے۔ قطب شاہی عہد کی دیگر مثنویوں میں جنیدیؔ کی مثنوی 'ماہ پیکر' اور طبعیؔ کی مثنوی 'بہرام وگل اندام' بھی قابلِ ذکر ہیں۔

قطب شاہی عہد کے خاتمے کے بعد دکن میں مغلیہ دور شروع ہوا۔ اس دور میں بھی چند اہم مثنویاں لکھی گئیں جن میں سے بیش تر مذہبی موضوعات پر ہیں۔ عزلت کی صوفیانہ مثنوی 'روضۃ الشہدا' وجدی کی مثنوی 'پنچھی باچھا' محمد علی حاجز کی مثنوی قصہ 'ملکۂ مصر' حسن ذوقی کی مثنوی 'وصال العاشقین' اور مجرمیؔ کی مثنوی 'گلشنِ حسن دل' اسی عہد کی یادگار ہیں۔ دکن میں مغلیہ عہد کے دو اہم شاعروں میں ولیؔ اور سراج اورنگ آبادی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ولیؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ البتہ انھوں نے چند مثنویاں بھی تحریر کی ہیں جن میں ایک مختصر مثنوی 'در مدح سورت' ہے۔ ولیؔ کے بالمقابل سراجؔ نے مثنوی نگاری کے میدان میں جم کر اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی چند اہم مثنویوں میں 'بوستان خیال'، 'سوز وگداز'، 'نالۂ ہجر'، 'احوال فراق'، 'خط بندگی' اور 'مطلبِ دل' قابلِ ذکر ہیں۔ 'بوستان خیال' اور 'سوز وگداز' زیادہ مشہور مثنویاں ہیں۔ 'بوستان خیال' میں سراج نے اپنی زندگی کے احوال قلم بند کیے ہیں۔ خصوصاً وارداتِ عشق کو انتہائی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ گیارہ سو ساٹھ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی انھوں نے محض دو دن میں لکھی ہے۔ اس سے فنِ مثنوی نگاری کی باریکیوں اور لوازمات سے ان کی آگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس مثنوی کی خوبی اس کے بیان کی سادگی ہے۔ اس میں واقعات کی پے چیدگی اور مشکل تراکیب والفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اپنے مخصوص انداز واسلوب کے سبب یہ مثنوی انفرادی شناخت رکھتی ہے۔ ولیؔ اور سراجؔ کے بعد دکن میں اردو مثنوی کا فروغ اس طرح نہیں ہوا لیکن یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بہمنی عہد میں اردو مثنوی نگاری کا جو سفر دکن میں شروع ہوا تھا، اس نے عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں اس قدر ترقی کی منزلیں طے کیں کہ اردو کی کئی بہترین مثنویاں منظرِ عام پر آئیں جو اردو شعروادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اس طرح دکن میں اردو مثنوی نگاری کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی۔

11.3.5 ماحصل

دکن میں اردو مثنوی نگاری کے مطالعے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دکن میں اردو مثنوی کی ایک توانا روایت رہی ہے۔ اس کا باضابطہ آغاز بہمنی دور میں ہوا۔ فخر دین نظامی بیدری کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' اردو کی پہلی مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔ بہمنی دور کی دیگر مثنویوں میں میراں جی شمس العشاق کی 'خوش نامہ'، 'خوش نغز' اور 'شہادۃ الحقیقت' اور اشرف بیابانی کی 'واحد باری'، 'لازم المبتدی' اور 'نوسرہار' کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ بہمنی عہد کے بعد بیجاپور کی عادل شاہی اور گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنتوں کے زیرِ اثر اردو مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ عادل شاہی عہد میں عبدل کی 'ابراہیم نامہ'، برہان الدین جانم کی 'ارشاد نامہ'، 'وصیت الہادی'، 'منفعت الایمان'

مقیمی کی 'چندر بدن و مہیار'، 'فتح نامہ' حسن شوقی کی 'فتح نامہ نظام شاہ'، 'میزبانی نامہ' نصرتی کی 'گلشن عشق'، 'علی نامہ'، 'تاریخِ سکندری' سید میراں ہاشمی کی 'یوسف زلیخا'، 'معراج نامہ' ملک خوشنود کی 'یوسف زلیخا'، 'جنت سنگار' اور رستمی کی 'خاور نامہ' جیسی اہم ترین مثنویوں نے دکن میں اردو مثنوی کی روایت کو مستحکم کیا۔ قطب شاہی عہد میں بھی کئی اہم مثنویاں لکھی گئیں جن میں احمد گجراتی کی 'یوسف زلیخا'، 'لیلیٰ مجنوں' ملا وجہی کی 'قطب مشتری' ابن نشاطی کی 'پھول بن' غواصی کی 'مینا ستونتی'، 'سیف الملوک و بدیع الجمال'، 'طوطی نامہ' جنیدی کی 'ماہ پیکر' اور طبعی کی 'بہرام و گل اندام' کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔ دکن میں مغلیہ عہد میں بھی کئی مثنویاں لکھی گئیں۔ عزلت کی 'روضۃ الشہدا' بحری کی 'من لگن' حسین ذوقی کی 'وصال العاشقین' مجری کی 'گلشنِ حسنِ دل' ولی کی 'در مدح سورت' اور سراج کی 'بوستانِ خیال' وغیرہ اسی عہد کی یادگار مثنویاں ہیں۔ اس طرح دکن میں اردو مثنوی نگاری کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے :

- مثنوی کے پس منظر سے واقفیت حاصل کی۔
- بہمنی دور میں اردو مثنوی کے ارتقا سے آگہی حاصل کی۔
- عادل شاہی دور میں اردو مثنوی کے ارتقا کے بارے میں معلومات حاصل کی۔
- قطب شاہی دور میں اردو مثنوی کے ارتقا سے واقفیت حاصل کی۔
- دکنی مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھا۔

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مثنوی کے پس منظر کے بارے میں مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ بہمنی دور کی تین اہم مثنویوں کے نام مع مصنف تحریر کیجیے۔

۳۔ عادل شاہی عہد کے اہم مثنوی نگار شعرا اور ان کی مثنویوں کے نام بتائیے۔

۴۔ قطب شاہی عہد کی اہم مثنویاں کون کون سی ہیں؟

۵۔ دکن میں مغلیہ عہد میں لکھی گئی چند قابلِ ذکر مثنویوں کے نام لکھیے۔

11.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عربی شاعری میں اس صنف کا رواج نہیں

رہا ہے۔ عربوں میں 'رجز' نام کی شعری صنف ضرور تھی جسے بعض علمائے ادب نے مثنوی سے مشابہ قرار دیا ہے۔ 'مثنوی' کا نام اہلِ ایران کا ایجاد کردہ ہے۔ اہلِ عرب نے اسے 'مزدوجہ' کا نام دیا ہے۔ صنفِ مثنوی کی موجودہ شکل نے ایران میں جنم لیا۔ فارسی زبان سے یہ صنف اردو میں آئی۔

۲۔ بہمنی دور کی تین اہم مثنویوں میں 'کدم راؤ پدم راؤ'، 'خوش نامہ' اور 'نوسر ہار' قابلِ ذکر ہیں۔ 'کدم راؤ پدم راؤ' کے مصنف فخر دین نظامی 'خوش نامہ' کے مصنف میراں جی شمس العشاق اور 'نوسر ہار' کے مصنف اشرف بیابانی ہیں۔

۳۔ عادل شاہی عہد کے اہم مثنوی نگار شعرا میں عبدل، برہان الدین جانم، مقیمی، حسن شوقی، نصرتی، سید میراں ہاشمی، ملک خوشنود اور رستمی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ عبدل کی مثنوی 'ابراہیم نامہ' برہان الدین جانم کی مثنویاں 'ارشاد نامہ'، 'وصیت الہادی'، 'منفعت الایمان' مقیمی کی مثنویاں 'چندر بدن ومہیار'، 'فتح نامہ' حسن شوقی کی مثنویاں 'فتح نامہ نظام شاہ'، 'میزبانی نامہ' نصرتی کی مثنویاں 'گلشن عشق'، 'علی نامہ'، 'تاریخِ سکندری' سید میراں ہاشمی کی مثنویاں 'یوسف زلیخا'، 'معراج نامہ' ملک خوشنود کی مثنویاں 'یوسف زلیخا'، 'جنت سنگار' اور رستمی کی مثنوی 'خاور نامہ' ہے۔

۴۔ قطب شاہی عہد میں کئی اہم مثنویاں لکھی گئیں جن میں احمد گجراتی کی 'یوسف زلیخا'، 'لیلیٰ مجنوں' ملا وجہی کی 'قطب مشتری' ابن نشاطی کی 'پھول بن' غواصی کی 'مینا ستونتی'، 'سیف الملوک وبدیع الجمال'، 'طوطی نامہ' جنیدی کی 'ماہ پیکر' اور طبعی کی 'بہرام وگل اندام' کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔

۵۔ دکن میں مغلیہ عہد میں لکھی گئی مثنویوں میں عزلت کی 'روضۃ الشہدا' بحری کی 'من لگن' حسین ذوقی کی 'وصال العاشقین' مجرمی کی 'گلشنِ حسنِ دل' ولی کی 'در مدح سورت' اور سراج اورنگ آبادی کی 'بوستانِ خیال' وغیرہ قابلِ ذکر مثنویاں ہیں۔

11.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
مثنوی	:	دو دو والا
استوار	:	قائم
محاکمہ	:	جائزہ
متداول	:	رائج

منبع	:	سرچشمہ، نکلنے کی جگہ
مستند	:	تصدیق کیا ہوا
رسہ کشی	:	کھینچا تانی، کش مکش
سرکوبی	:	سر کچلنا، سزا دینا
مہمات	:	جنگیں، لڑائیاں
معرفت	:	علمِ الٰہی، خداشناسی
امتزاج	:	آمیزش، ہم آہنگی
محیط	:	احاطہ کرنے والا، گھیرے میں لینے والا
ماخذ	:	جس سے اخذ کیا جائے، بنیاد
شریعت	:	مذہبی قانون، قانونِ الٰہی
رزمیہ	:	وہ داستان جس میں جنگ کے حالات و واقعات قلم بند کیے گئے ہوں۔
انحطاط	:	تنزلی، پستی
خصلت	:	عادت، مزاج
پرماتما	:	اعلیٰ رُوح، وشنو، خدا

11.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں : ڈاکٹر گیان چند جین

۲۔ اتر پردیش میں اردو مثنوی نگاری : علی جواد زیدی

۳۔ تاریخ ادب اردو : ڈاکٹر جمیل جالبی

۴۔ اردو مثنوی کا ارتقا : عبدالقادر سروری

۵۔ اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) : سید محمد عقیل رضوی

۶۔ جدید اردو مثنوی: فن اور فکری ابعاد : ظفر انصاری ظفؔر

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 12 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

ساخت

12.1 اغراض و مقاصد

12.2 تمہید

12.3 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

12.3.1 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا آغاز

12.3.2 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

12.3.3 شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگار

12.3.4 حاصل مطالعہ

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

12.6 سوالوں کے جوابات

12.7 فرہنگ

12.8 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- شمالی ہند میں اردو مثنوی کے آغاز کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- شمالی ہند میں اردو مثنوی کے ارتقا سے واقف ہوں گے۔
- شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگاروں سے متعارف ہوں گے۔
- شمالی ہند کی نمائندہ مثنویوں کے بارے میں جان کاری حاصل کریں گے۔
- شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے واقف ہوں گے۔

12.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات سے واقف ہوئے۔آپ نے مثنوی کی اقسام کو بھی جانا اور دکن میں اردو مثنوی کے ارتقا سے بھی واقفیت حاصل کی۔اب اس اکائی میں آپ شمالی ہند میں اردو مثنوی کے آغاز و ارتقا، نمائندہ مثنوی نگار اور نمائندہ مثنویوں سے واقف ہوں گے اور شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

12.3 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

12.3.1 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا آغاز

مولانا عبدالسلام ندوی کے مطابق شمالی ہند کا پہلا مثنوی نگار شاعر ہونے کا شرف میر تقی میرؔ کو حاصل ہے۔انھوں نے میر تقی میر کو اردو مثنوی کا موجد کہا ہے لیکن جدید تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ میر سے پہلے بھی اردو مثنوی لکھی جانے لگی تھی۔صوفیائے کرام نے جو مثنویاں کہی ہیں، وہ بھی تاریخی اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں۔متفقہ طور پر شمالی ہند کی پہلی مثنوی افضل پانی پتی کی ’بکٹ کہانی‘ ہے جو بارہ ماسہ کی صورت میں ہے۔اس میں اپنے محبوب کے فراق اور ہجر کے دوران ایک عورت کے دل پر بیتی ہوئی کیفیات و واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔میر جعفر زٹلی نے باضابطہ مثنوی نہیں لکھی لیکن ان کی نظموں ’جوبن نامہ‘ اور ’اختلاف زماں‘ کو شمالی ہند کی مثنویوں کے ابتدائی نقوش کہا جا سکتا ہے۔زٹلی کی مشہور مثنوی ’ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالم گیر بادشاہ غازی‘ کے عنوان سے ہے۔اس میں اورنگ زیب کے دکنی فتوحات کا ذکر ہے۔زٹلی کے کلام کی اہم خصوصیت طنزیہ اسلوب ہے۔انھوں نے اس عہد کے سماج، سیاست، معیشت اور نااہل بادشاہوں پر ناقابل یقین اشعار قلم بند کیے جس کی وجہ سے انھیں جان بھی گنوانی پڑی۔ولیؔ کے دیوان کی دہلی آمد سے جب شمالی ہند میں اردو غزل گوئی کا رواج ہوا تو صنفِ مثنوی کی طرف بھی توجہ دی گئی۔شاہ مبارک آبرو، حاتم، فائز اور میر تقی میر جیسے شعرا نے صنفِ مثنوی میں طبع آزمائی کی۔حاتم کے دیوان زادہ میں کل پانچ مثنویاں ہیں جن میں ’تمباکو‘ اور ’حقہ اور قہوے‘ قابلِ ذکر ہیں۔شاہ مبارک آبروؔ کی مثنوی ’آرائش معشوق‘ میں حسن کو موضوع بنایا گیا ہے۔فائز کی مثنویوں کی کل تعداد سولہ ہے۔ان کی اہم مثنویوں میں ’در وصف بھنگیڑن‘، ’در وصف کا چھن‘، ’تعریف جوگن‘، ’تعریف ہولی‘، ’بیان میلہ بہتہ‘ اور ’تعریف نہاں نگنبوذ‘ قابلِ ذکر ہیں۔یہ سب کہیں نہ کہیں ولی کے طرز کی مثنویاں ہیں۔ان شعرا کے بعد شمالی ہند میں اردو مثنوی نگاری میں میرؔ کا نام آتا ہے۔

12.3.2 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

شمالی ہند میں اردو مثنوی کی ترقی کا سہرا میرؔ تقی میر کے سر جاتا ہے۔اس سے قبل بھی اس کے نمونے دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے لیکن شمالی ہند میں اردو مثنوی میر تقی میر ہی کی مثنویوں کے ذریعے

متعارف ہوئی۔ میر نے چھوٹی چھوٹی کئی مثنویاں لکھیں جن کی تعداد ۳۸ تک پہنچتی ہے۔ان کی بیش تر مثنویوں کا موضوع عشق ہے۔انھوں نے حیوانات کے احوال، سماج اور فرد کی حالت زار، شکارنامہ، بیان مرغ بازاں، دنیا کی بے ثباتی، اور جشن شادی کے موضوعات کو بھی مثنویوں میں جگہ دی ہے لیکن ان کی مثنوی نگاری کا محور عشق اور اس کی کیفیات کا بیان ہے۔'دریائے عشق' اور 'شعلۂ عشق' ان کی نمائندہ مثنویاں ہیں۔ان کی مثنویوں میں غم زندگی کو غم زمانہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔میر کی مثنویوں کی زبان سادہ، سہل اور عام فہم ہے۔ان کی مثنویوں میں قصہ پن کی کمی کھٹکتی ہے۔اس کی وجہ قصہ کی پوری وضاحت وصراحت کی کمی، جزئیات نگاری پر کم توجہ اور کہانی کے پس منظر پر جلد بازی ہے۔ان کی مثنویوں میں 'دریائے عشق' مشہور مثنوی ہے جس میں انھوں نے اپنے گھر کی خستہ حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔یہ مثنوی بہت مقبول ہوئی۔اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک عاشق محبوبہ کی جوتی کے لیے دریا میں چھلانگ لگاتا ہے جس کے سبب وہ ڈوب جاتا ہے۔کچھ دنوں کے بعد اس کی محبوبہ بھی ٹھیک اسی مقام پر غرقِ دریا ہو کر اپنی جان دے دیتی ہے۔یہ مثنوی فوق فطری عناصر سے پاک ہے اور اس میں بے جا مبالغہ آرائی سے گریز کیا گیا ہے۔اس طرح یہ مثنوی ایک سچے عشقیہ قصے کے طور پر منظر عام پر آتی ہے۔میر تقی میر کی مثنویوں میں پلاٹ ڈھیلے ہیں اور کردار نگاری میں زور کا فقدان ہے تاہم میر نے شاہ مبارک آبرو، حاتم اور فائز کے بالمقابل اپنی مثنویوں میں مرقعوں اور جزئیات نگاری پر زیادہ توجہ مرکوز کی۔انھوں نے قصوں کو بھی مثنویوں میں جگہ دینی شروع کی لیکن اس کے باوجود ان کی مثنویوں میں فنی پختگی کا فقدان ہے۔ان کے قصوں میں سادگی زیادہ اور مافوق الفطرت عناصر کی کمی ہے لیکن ان کی مثنویاں رومانیت اور نسوانی نفسیات سے پر نظر آتی ہیں البتہ ان کے یہاں مناظر اور مکالمہ کا فقدان پایا جاتا ہے۔ان سب باتوں سے قطع نظر اردو مثنوی نگاری میں میر تقی میر تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔وہ اس وقت مثنوی کی طرف متوجہ ہوئے جب ان کے سامنے مثنوی کا کوئی واضح اور عمدہ نمونہ موجود نہیں تھا۔

میر تقی میر کے ہم عصروں میں مرزا محمد رفیع سوداؔ نے بھی مثنوی کی طرف رجوع کیا۔ان کی شاعری کا اصل محور غزل اور قصیدہ ہے۔انھوں نے غزل اور قصیدہ کے علاوہ مثنویاں بھی تخلیق کی ہیں جن کی تعداد ۲۴ تک پہنچتی ہے۔انھوں نے اپنی مثنویوں میں ہجر، اخلاق، تہذیب، تنقید، آب وہوا، خط وکتابت اور مدح کے مضامین بیان کیے ہیں۔چوں کہ سودا بنیادی طور پر قصیدہ گو ہیں، اس لیے ان کی مثنویوں میں بھی اس کا رنگ نمایاں ہے۔انھوں نے مثنوی کو ہجویہ رنگ دے کر زوال آمادہ سماج کی تصویرکشی کی ہے۔ان کی مثنویوں میں طرز ادا کی خامیاں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ان کی صرف ایک مثنوی کو قابل اعتنا سمجھا گیا جس کا عنوان 'زرگر پسر و شیشہ گر' ہے۔سوداؔ کے یہاں قصوں میں اختصار پایا جاتا ہے۔ان کی کردار نگاری میں بھی خامیاں نظر آتی ہیں۔وہ جزئیات نگاری پر توجہ نہیں دیتے اور محاکات میں بے جا تخیل پروازی کا سہارا لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی مثنویاں فنی اعتبار سے ناقص نظر آتی ہیں۔دہلی کی مثنویوں کا تاریخی محاکمہ کیا جائے تو اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک دہلی

کی تباہی سے قبل کی مثنویاں اور دوسری تباہی کے بعد کی مثنویاں۔ درج بالا مثنویاں تباہی کے قبل کی ہیں جن میں صرف ایک مثنوی 'خواب وخیال' ہے جو اس عہد کی تمام مثنویوں میں ممتاز اور طویل ہے۔ اس مثنوی کو خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر نے لکھا ہے۔ میر اثر کو صاحب طرز مثنوی نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اردو مثنوی نگاری میں ان کا نام میر حسن کے بعد لیا جاتا ہے۔ انھوں نے مثنوی 'خواب وخیال' کے ذریعے ہجر و وصال، راز و نیاز اور عشق و محبت کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ 'خواب وخیال' کے متعلق مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ "شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت و شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی 'خواب وخیال' کا مقابلہ کر سکتی ہے"۔ اس مثنوی کی سادگی اور لطافت قابل تعریف ہے جب کہ مرقع نگاری میں میر اثر اپنے تمام پیش رو کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ مثنوی اہل نقد کی نظر میں زبان و بیان کے لحاظ سے سحر البیان کے بعد بے مثال قرار دی گئی ہے۔ اس مثنوی میں کسی ایک قصہ پر پلاٹ نہیں گٹھا گیا ہے بلکہ یہ کئی قصوں کا مجموعہ ہے جس میں اخلاق پر بحث کی گئی ہے۔ قاری کو اس میں پچاس سے زیادہ واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس مثنوی کی ایک اہم خوبی اس کا سراپا ہے جو تقریباً سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی زبان صاف ستھری اور رواں دواں ہے۔ محاورات کے مناسب استعمال نے اس مثنوی میں چار چاند لگا دیا ہے۔ اس مثنوی میں عشقیہ جذبات کو بھی خوب صورت طریقے سے ابھارا گیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس مثنوی کی سب سے بڑی خامی قصہ کا بے ربط پن ہے جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کو زبردستی پرویا گیا ہے۔ اس کی تقلید میں کئی مثنویاں منظرِ عام پر آئیں مگر جو شہرت و مقبولیت اس مثنوی کو حاصل ہوئی، وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

زوالِ دہلی کے بعد شمالی ہند میں اردو کو اودھ کے حکمرانوں کی سرپرستی میں فیض آباد اور لکھنؤ کے نام سے نئے باغات میسر آئے جس نے اردو مثنوی کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ نئے باغات چند دن میں ہی ثمر سے پُر ہو گئے اور رشکِ دبستان دہلی بن گئے۔ یہاں کی مثنویوں میں وہ سبھی عناصر دکھائی دیتے ہیں جو فارسی مثنوی کے ہم پلہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ چوں کہ دبستان لکھنؤ کے شعرا کے نزدیک دہلی کی مثنویوں کے نمونے تھے اور بعض شعرا کی آمد ہی دہلی سے تھی، اس لیے لکھنؤ کی ابتدائی مثنویوں میں دہلی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ مثلاً قائم چاند پوری اور میر سوز کی مثنویوں میں یہ رنگ نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی رنگ میں میر دردؔ کے شاگرد ہدایت اللہ خاں ہدایت کی مثنوی ہے جو شہر بنارس کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ مرزا علی لطف کی مثنوی 'نیرنگ عشق' زبان و بیان میں میرؔ کی مثنویوں کی طرح سادہ اور سلیس ہے۔ یہ مثنوی مصحفیؔ اور جرأتؔ کی مثنویوں کے مقابلے میں طویل ہے۔ اس میں ایک شاہ صاحب کی محبت کی داستان ہے جو عروسہ کے حسن پر اس قدر فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ اس کا محافہ ان کے تکیہ کے قریب ٹھہرتا ہے اور جب وہ محافہ وہاں سے روانہ ہوتا ہے تو ان کی جان چلی جاتی ہے۔ جب یہ بات اس عروسہ کو پتہ چلتی ہے کہ اس کا عاشق دار فانی کوچ کر گیا ہے تو وہ ان کی قبر پر جا کر جان دے دیتی ہے۔

دبستان لکھنؤ کی شہرۂ آفاق مثنوی 'سحر البیان' ہے۔ میر حسن کی یہ مثنوی گذشتہ سبھی مثنویوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ میر حسن کی یہ مثنوی اردو مثنوی کی تاریخ میں شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ سحر البیان کے بعد بھی کئی ایسی مثنویاں لکھی گئیں جو قاری کو اپنی جدت کا پتہ دیتی ہیں۔ مثلاً غلام ہمدانی مصحفی کا 'بحر المحبت' ہے جس کا انداز میر کے 'دریائے عشق' کا سا ہے اور قصہ میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصحفی نے میر کے موضوع کو ندرت کے ساتھ پیش کر کے اسے 'سحر البیان' کا ہم پلہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کوشش میں انھیں ناکامی ملی ہے کیوں کہ اس کی زبان میں صناعی دکھائی دیتی ہے۔

دہلی اجڑنے کے بعد پھر جب وہاں حالات سازگار ہوئے تو ایک مرتبہ پھر شعروشاعری کی محفل سجی اور ذوق، غالب اور مومن جیسے شعرا نے اردو شاعری کو توانائی عطا کی اور اسے بلندی پر پہنچایا۔ غالب اور مومن نے غزلوں کے علاوہ مثنویاں بھی لکھیں۔ غالب کی ایک مثنوی 'درصفت انبہ' بہت معروف ہے۔ دوبارہ جب دہلی میں شعروشاعری کی محفل قائم ہوئی تو غزل گوئی کو جو فروغ حاصل ہوا وہ اردو مثنوی کو میسر نہیں آیا۔ اردو مثنوی کا اصل فروغ لکھنو میں ہوا۔

دبستانِ لکھنو میں 'سحر البیان' کے بعد جس مثنوی کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، وہ پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' ہے۔ یہ مثنوی دبستان لکھنؤ کی شہرہ آفاق تصنیف قرار دی جاتی ہے۔ مثنوی 'گلزار نسیم' کی تقلید میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں مگر وہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکیں۔ مثلاً آفتاب الدولہ قلق کی مثنوی 'طلسمِ الفت' کی حیثیت بھی مسلم ہے لیکن یہ مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی طرح ممتاز نہیں ہوسکی۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' کے ساتھ ساتھ دبستان لکھنو میں جس مثنوی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی، وہ مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی 'زہر عشق' ہے۔ یہ بھی اردو کی نمائندہ مثنویوں میں سے ایک ہے۔ منیر شکوہ آبادی کا تعلق بھی دبستان لکھنو سے ہے۔ انھوں نے بھی مثنوی لکھی ہے لیکن ان کی مثنوی 'معراج المضامین' مذہبی موضوعات پر لکھی گئی ہے جس سے اس کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب ادب کا منظر نامہ بدلا تو مثنوی کے موضوعات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ واجد علی شاہ، امیر مینائی، امیر اللہ تسلیم، داغ دہلوی اور شوق قدوائی اس عہد کے نمائندہ مثنوی نگار شعرا ہیں۔ ان شعرا نے مثنوی کے روایتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے جدید اثرات کو بھی پیوست کرنے کا کام کیا۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب لاہور کے تحت جدید مثنوی کی بنیاد ڈالی۔ اب مثنوی عشق و عاشقی کی داستان سے نکل کر حقیقت کے قریب ہوتی نظر آئی۔ اب مثنوی مافوق الفطرت عناصر سے پاک ہو کر زندگی کے حقائق سے ممیز ہونے لگی۔ قدیم مثنوی میں عشق محور و مرکز تھا لیکن اب جدید عہد میں اس کی حیثیت ضمنی ہو کر رہ گئی۔ اب سماج، قوم، سیاست اور معیشت کے موضوعات تسلیم کیے گئے۔ اس عہد میں داغ، امیر اور محسن کی مثنویاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن پنجاب کے زیر اثر

اردو شاعری میں نئی فکر کو اہمیت دی گئی اور فطری اور حقیقی شاعری پر زور دیا جانے لگا۔ اس ضمن میں محمد حسین آزاد، سرسید اور حالی پیش پیش رہے۔ سرسید کی اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں حالی کی 'برکھارت' اور 'چپ کی داد' جیسی مثنویاں منظر عام پر آئیں۔ محمد حسین آزاد نے بھی کئی مثنویاں لکھیں جس میں نیچرل شاعری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے افکار واحساسات کے اظہار کے لیے مثنوی کو وسیلہ بنایا۔ ان کی مثنویوں میں 'سید کی لوح تربت'، 'انسان اور بزم قدرت'، اور 'رخصت اے بزم جہاں' معروف ہیں۔ ان کے 'ساقی نامہ' میں بھی مثنوی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس کے ذریعے اقبال نے جو پیغام دیا ہے، اس کے نمونے کم ہی ملتے ہیں۔ جوش نے بھی کئی عمدہ مثنویاں لکھیں جس میں 'جنگل کی شہزادی'، 'جمنا کے کنارے' اور 'بیوہ سہاگن' نہایت اہم ہیں۔ حفیظ جالندھری کی 'شاہنامہ اسلام' جدید عہد کی سب سے طویل مثنوی ہے جس کے اشعار زبان زد عام ہیں۔ اس کا دیباچہ شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اسلام کی منظوم تاریخ ہے۔ انھوں نے اسے اخلاق اسلامی کی تعلیم کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس کے الفاظ سادہ اور مترنم ہیں۔ بہ طور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ستاروں کی شہادت پر ظہور مہر تاباں ہے
سحر کا رنگ کیا ہے، سرخیٔ خونِ شہیداں ہے

زمیں اہل وفا کے خون سے نم ناک ہوتی ہے
تو آزادی یہاں ہل جوتتی ہے بیج بوتی ہے

احد کے داغ دھبے باغ باں نے پاک فرمائے
تو پھر ستر شہید اس میں سپرد خاک فرمائے

ترقی پسند شعرا نے بھی اپنے افکار وخیالات کی تشہیر کے لیے مثنوی کا سہارا لیا جس میں سردار جعفری کی مثنوی 'جمہور' کیفی کی 'خانہ جنگی' اور جاں نثار اختر کی 'امن نامہ' اپنے موضوع اور انداز بیان کی وجہ سے نمائندہ مثنویاں ہیں۔ شمالی ہند میں اردو مثنوی کے جائزے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہاں اردو مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا خصوصاً لکھنو میں اردو مثنوی اپنے عروج کو پہنچی۔ 'سحر البیان'، 'گلزار نسیم' اور 'زہر عشق' جیسی مثنویاں دبستان لکھنو ہی کی یادگار ہیں۔

12.3.3 شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگار

شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگار میر حسن، پنڈت دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق لکھنوی ہیں۔ میر حسن نے کل بارہ مثنویاں لکھیں جن میں مثنوی 'سحر البیان' اردو کی لازوال اور یادگار مثنوی ہے۔ اردو شاعری میں کسی مثنوی کو وہ مقبولیت نہیں ملی جو مثنوی 'سحر البیان' کو حاصل ہوئی۔ یہ باضابطہ پہلی مثنوی ہے جس میں خالص ادبیت کے نمونے ملتے

ہیں۔ یہ مثنوی کل ۱۲۱۷۹ اشعار پر مشتمل ہے اور اپنے مکالمے، کردار، منظر نگاری، جزئیات نگاری اور زبان و بیان کے لحاظ سے اردو کی نمائندہ مثنوی ہے۔ یہ مثنوی 'قصہ بے نظیر اور بدر منیر' کے نام سے بھی معروف ہے کیوں کہ اس میں ان دونوں کی محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں لکھنوی معاشرت کی دل چسپ مصوری کی گئی ہے۔ اس لیے یہ مثنوی لکھنوی تہذیب کی نمائندہ مثنوی قرار دی گئی ہے۔ اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے کردار اور مناظر میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہے۔ اس میں حکمراں طبقہ کی شان و شوکت، محل کی رونق، اولاد کی کمی کی شکایت، ناامیدی کا رجحان، نجومیوں کی شعبدہ بازی، بچے کی ولادت کے رسوم، ناچنے گانے والیوں کی ادائیں، عمارت کی بلندی، خوشی کے مواقع، غرض لکھنوی معاشرت سے متعلق تمام واقعات وحالات اپنی دل کش صورتوں میں موجود ہیں۔ اس طرح یہ مثنوی اپنے عہد کے سماج کا ترجمان بن جاتی ہے۔ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''بے نظیر اور بدر منیر کی داستانِ عشق اپنے فوق الفطرت عناصر اور نصب العینی ماحول کے باوجود حیات انسانی کی اصلی اور بنیادی صداقتوں اور فطرت انسانی کی غیر متغیر حقیقتوں سے معمور ہے۔ وہ ایک مسلسل قصہ ہے اور عمدہ فن کاری کا نمونہ۔''
>
> (عبدالقادر سروری، اردو مثنوی کا ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۶۸ء، ص: ۱۲۰)

میر حسن نے نجم النساء کے نسوانی کردار میں جو فطری عناصر اور جذبات نگاری کے نمونے پیش کیے ہیں، وہ مشاہدات پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس مثنوی میں مناظر کو دل کش انداز میں نظم کیا ہے جس سے مسحور کن کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مثنوی اپنی مکالمہ نگاری کے حوالے سے بھی ممتاز ہے کیوں کہ اس کے مکالمے دہلی کے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ بسیط اور قدیم شاعروں کے مقابلے میں روزمرہ کے الفاظ پر مبنی ہیں مثلاً۔

ذرا منصفو! داد کی ہے یہ جا
کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا
زبس عمر کی اس کہانی میں صرف
تب ایسے یہ موتی سے نکلے ہیں حرف
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں
نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیاں

اردو مثنوی کی تاریخ میں میر حسن اور ان کی مثنوی 'سحر البیان' کو لازوال حیثیت حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو مثنوی کا نام آتے ہی میر حسن کا نام ذہن میں آتا ہے۔ 'در وصف قصر جواہر'، 'رموز العارفین' اور 'گلزار ارم' بھی

میر حسن کی قابلِ ذکر مثنویاں ہیں۔

شمالی ہند کے مثنوی نگاروں میں پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام بھی بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے 'گلزار نسیم' کے عنوان سے لافانی مثنوی تخلیق کی۔ یہ مثنوی ۱۸۳۸ء میں وجود میں آئی۔ یہ مثنوی اپنے اختصار، حسن کاری اور صنعت گری میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا قصہ طبع زاد نہیں ہے۔ یہ عزت اللہ بنگالی کی فارسی تصنیف سے ماخوذ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ نہال چند لاہوری نے فورٹ ولیم کالج میں کیا تھا اور نسیم نے اسے 'گلزار نسیم' کی شکل میں پیش کر دیا۔ اس کا ایجاز و اختصار ہی فن کا معجزہ ہے جس میں نسیم نے سحر کاری کا جادو دکھایا ہے۔ اس کا قصہ مختصراً یوں ہے کہ سلطان زین الملوک پورب کا بادشاہ ہے۔ اس کے چار لڑکے ہیں۔ پانچویں لڑکے کی پیدائش سے قبل نجومی بتاتا ہے کہ اگر اس کی پیدائش کے وقت بادشاہ کی نظر اس پر پڑی تو اس کی بینائی ختم ہو جائے گی۔ لہذا اسے بادشاہ کی نظروں سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اچانک بادشاہ کی نظر اس پر پڑتی ہے اور وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ ایک حکیم بتاتا ہے کہ باغِ ارم میں بکاولی نام کا ایک پھول ہے جس کے استعمال سے بینائی واپس ہو سکتی ہے۔ چنانچہ چاروں شہزادے اس کی تلاش میں رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ اس تلاشِ گل میں پانچواں شہزادہ بھی ساتھ ہو جاتا ہے۔ ایک بیسوا جس کا نام دل بر ہے، جوا کھیلتی ہے اور لوگوں کو بیوقوف بنا کر ساری رقم جیت لیتی ہے مگر اس کھیل میں پانچواں شہزادہ تاج الملوک جیتنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو ایک دیو کے ساتھ مل کر اور دیونی کی مدد سے بکاولی پھول حاصل کرتا ہے۔ اس طرح بادشاہ کی بینائی واپس آ جاتی ہے۔ اس کا پلاٹ بہت پیچیدہ ہے۔ یہ محض پھول کو حاصل کرنے کا واقعہ نہیں ہے بلکہ قصہ در قصہ جڑتا ہوا اس کا پلاٹ آگے بڑھتا ہے اور تاج الملوک اور بکاولی کی شادی کے ساتھ مثنوی انجام کو پہنچتی ہے۔ اس میں لکھنوی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے کیوں کہ اس عہد کا سماج عیش و نشاط میں ڈوبا ہوا تھا اور اس معاشرہ میں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس پر عورت کا حکم نہ چلتا ہو۔ اس مثنوی میں عورت کے کردار کو مضبوط اور مرد کو مردانگی سے محروم بتایا گیا ہے۔ دایہ، دلبر بیسوا، حمالہ دیونی، محمودہ، بکاولی، سمن پری، جمیلہ پری، روح افزا پری، رانی چتراوت، دہقان زادی اور اسی طرح کے نسوانی کردار پوری مثنوی پر حاوی نظر آتے ہیں جب کہ مردانہ کردار کی شکل میں تاج الملوک کے چاروں بھائی نکمے نظر آتے ہیں۔

پردہ جو حجاب سا اٹھایا
آرام میں اس پری کو پایا
بند اس کی وہ چشم نرگسی تھی
چھاتی کچھ کچھ کھلی ہوئی تھی

سمٹی تھی جو محرم اس قمر کی
برجوں پہ سے چاندنی تھی سر کی

لپٹے تھے جو بال کروٹوں میں
مل کھا گئی تھی کمر لٹوں میں

یہ اشعار لکھنو کے زوال آمادہ سماج کی عریانیت کے عکاس ہیں۔اس طرح کے اشعار مثنوی میں جا بہ جا موجود ہیں۔ یہ مثنوی اپنے منفرد لب ولہجہ، اختصار اور پلاٹ کے گٹھے ہوئے ہونے کی وجہ سے فنی اعتبار سے شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دبستان لکھنؤ کی نمائندہ مثنوی ہے جس میں لکھنوی معاشرت کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔صنائع و بدائع کے خوب صورت استعمال، برمحل مکالمے، جذبات نگاری اور منظر نگاری نے اس مثنوی کو دل کش بنا دیا ہے۔اس مثنوی کو لکھنوی معاشرت کا جیتا جاگتا مرقع بھی کہا جاتا ہے۔

شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگاروں میں مرزا شوق لکھنوی کا نام بھی بے حد اہم ہے۔انھوں نے تین یادگار مثنویاں تخلیق کیں جو 'فریب عشق'، 'بہار عشق' اور 'زہر عشق' کے عنوان سے منظر عام پر آئیں۔ان کی مثنویوں میں 'زہر عشق' کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک حزنیہ مثنوی ہے۔اس میں محبت کی المناکی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کی زبان و بیان، مکالمے اور ماحول کی حزنیہ پیش کش قاری کو مسحور کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس میں محاورات کی برجستگی اور نغمگی پائی جاتی ہے۔اس میں بیگمات لکھنؤ کی زبان، ضرب المثل اور محاورات کو اتنی خوبی سے پرویا گیا ہے کہ جاذبیت اور دل کشی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ مثنوی بھی لکھنوی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ جذبات نگاری، برمحل مکالمے، منظر نگاری اور اسلوب کی سادگی اس مثنوی کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ یہ مثنوی بھی اردو کی ایک نمائندہ مثنوی ہے۔

12.3.4 حاصل مطالعہ

شمالی ہند میں اردو مثنوی کا آغاز افضل پانی پتی کی 'بکٹ کہانی' سے ہوا۔ میر جعفر زٹلی نے باضابطہ مثنوی نہیں لکھی لیکن ان کی نظمیں 'جوبن نامہ' اور 'اختلاف زماں' میں اردو مثنوی کے ابتدائی نقوش موجود ہیں۔صوفیائے کرام کی مثنویاں تاریخی اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں۔ ولی کے دیوان کی دہلی آمد سے جب شمالی ہند میں اردو غزل گوئی کا رواج ہوا تو صنفِ مثنوی کی طرف بھی توجہ دی گئی۔شاہ مبارک آبرو، حاتم، فائز، میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا جیسے شعرا نے صنفِ مثنوی میں طبع آزمائی کی۔ اس عہد کی بلکہ دبستان دہلی کی نمائندہ مثنوی 'خواب وخیال' ہے جسے خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر نے لکھا ہے۔اس مثنوی کی سادگی اور لطافت قابل تعریف ہے جب کہ مرقع نگاری میں میر اثر اپنے تمام پیش رووں کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ دہلی کی تباہی کے بعد دبستان لکھنو اردو شاعری کا مرکز قرار پاتا ہے۔قائم چاند پوری، میر سوز، ہدایت اللہ خاں ہدایت، مرزا علی لطف، مصحفی اور جرأت اسی دبستان سے وابستہ شعرا ہیں۔ان شعرا نے بھی مثنویاں تخلیق کیں اور اپنی صلاحیت کے مطابق اس میں کمال کا مظاہرہ کیا۔ دہلی میں جب دوبارہ شعر وشاعری کی محفل جمی تو غالب اور مومن نے غزلوں کے علاوہ مثنویاں بھی

لکھیں لیکن اردو مثنوی اپنے عروج پر دبستان لکھنو میں ہی پہنچی۔ 'سحرالبیان'، 'گلزارنسیم' اور 'زہرعشق' جیسی یادگار اور لازوال مثنویاں اسی دبستان میں وجود میں آئیں۔ میرحسن، پنڈت دیاشنکرنسیم اور مرزاشوق لکھنوی نے اپنی فنی مہارت سے اردو مثنوی کو انتہائی بلندی پر پہنچایا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ادب کا منظرنامہ بدلا تو مثنوی کے موضوعات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ واجد علی شاہ، امیر مینائی، امیراللہ تسلیم، داغ دہلوی اور شوق قدوائی نے مثنوی کے روایتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے جدید اثرات کو بھی پیوست کرنے کا کام کیا۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب لاہور کے تحت جدید مثنوی کی بنیاد ڈالی۔ اب مثنوی مافوق الفطرت عناصر سے پاک ہوکر زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ ہونے لگی۔ قدیم مثنویوں میں حسن وعشق اور رزم وبزم کے موضوعات حاوی تھے لیکن اب سماج، قوم، سیاست اور معیشت کے موضوعات تسلیم کیے گئے۔ اس عہد میں داغ، امیر اور محسن کی مثنویاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن پنجاب کے زیراثر اور سرسید کی اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں حالی کی 'برکھارت' اور 'چپ کی داد' جیسی مثنویاں منظرعام پر آئیں۔ محمد حسین آزاد نے بھی کئی مثنویاں لکھیں جس میں نیچرل شاعری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے افکار واحساسات کے اظہار کے لیے مثنوی کو وسیلہ بنایا۔ ان کی مثنویوں میں 'سید کی لوحِ تربت'، 'انسان اور بزم قدرت'، اور 'رخصت اے بزم جہاں' معروف ہیں۔ ان کے 'ساقی نامہ' میں بھی مثنوی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ جوش نے بھی کئی عمدہ مثنویاں لکھیں جس میں 'جنگل کی شہزادی'، 'جمنا کے کنارے' اور 'بیوہ سہاگن' نہایت اہم ہیں۔ حفیظ جالندھری کی 'شاہنامۂ اسلام' جدید عہد کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ ترقی پسند شعرا نے بھی اپنے افکار وخیالات کی تشہیر کے لیے مثنوی کا سہارا لیا جس میں سردار جعفری کی مثنوی 'جمہور' کیفی کی 'خانہ جنگی' اور جاں نثار اختر کی 'امن نامہ' اپنے موضوع اور انداز بیان کی وجہ سے نمائندہ مثنویاں ہیں۔ اس طرح شمالی ہند میں اردو مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا اور اس کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی۔

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- شمالی ہند میں اردو مثنوی کے آغاز کے بارے میں معلومات حاصل کی۔
- شمالی ہند میں اردو مثنوی کے ارتقا سے واقفیت حاصل کی۔
- شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگاروں کے بارے میں آگہی حاصل کی۔
- شمالی ہند کی نمائندہ مثنویوں کے بارے میں جان کاری حاصل کی۔
- شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات وامتیازات سے واقفیت حاصل کی۔

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ شمالی ہند کی پہلی مثنوی کون سی ہے اوراس کے خالق کون ہیں؟

۲۔ شمالی ہند کی اہم مثنویوں کے نام بتائیے۔

۳۔ شمالی ہند کی مثنویوں کے موضوعات پر مختصراً اظہار خیال کیجیے۔

۴۔ میر تقی میر کی مثنوی نگاری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۵۔ مثنوی 'خواب وخیال' کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

12.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ شمالی ہند کی پہلی مثنوی 'بکٹ کہانی' ہے اوراس کے خالق افضل پانی پتی ہیں۔

۲۔ شمالی ہند کی اہم مثنویوں میں 'خواب وخیال'، 'سحر البیان'، 'گلزار نسیم' اور 'زہر عشق' قابلِ ذکر ہیں۔

۳۔ شمالی ہند کی قدیم مثنویوں کے موضوعات میں حسن وعشق کو کلیدی جگہ حاصل ہے۔ جدید مثنویوں میں سماجی، سیاسی، قومی، ملکی، انفرادی اوراجتماعی ہر طرح کے مسائل، انسانی قدروں اور زندگی کے نشیب و فراز کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پھلوں، میلہ اور تہوار کو بھی جگہ ملی ہے۔

۴۔ میر نے چھوٹی چھوٹی کئی مثنویاں لکھیں جن کی تعداد ۳۸ تک پہنچتی ہے۔ ان کی بیش تر مثنویوں کا موضوع عشق ہے۔ انھوں نے حیوانات کے احوال، سماج اور فرد کی حالت زار، شکارنامہ، بیان مرغ بازاں، دنیا کی بے ثباتی، اورجشن شادی کے موضوعات کو بھی مثنویوں میں جگہ دی ہے لیکن ان کی مثنوی نگاری کا محور عشق اوراس کی کیفیات کا بیان ہے۔ 'دریائے عشق' اور 'شعلۂ عشق' ان کی نمائندہ مثنویاں ہیں۔ ان کی مثنویوں میں غم زندگی کو غم زمانہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ میر کی مثنویوں کی زبان سادہ، سہل اور عام فہم ہے۔ ان کی مثنویوں میں قصہ پن کی کمی کھٹکتی ہے۔ اس کی وجہ قصہ کی پوری وضاحت و صراحت کی کمی، جزئیات نگاری پر کم توجہ اور کہانی کے پس منظر پر جلد بازی ہے۔ میر تقی میر کی مثنویوں میں پلاٹ ڈھیلے ہیں اور کردار نگاری میں زور کا فقدان ہے تاہم میر نے شاہ مبارک آبرو، حاتم اور فائز کے بالمقابل اپنی مثنویوں میں مرقعوں اور جزئیات نگاری پر زیادہ توجہ مرکوز کی۔ انھوں نے قصوں کو بھی مثنویوں میں جگہ دینی شروع کی لیکن اس کے باوجود ان کی مثنویوں میں فنی پختگی کا فقدان ہے۔ ان کے قصوں میں سادگی زیادہ اور مافوق الفطرت عناصر کی کمی ہے لیکن ان کی مثنویاں رومانیت اور نسوانی نفسیات سے پر نظر آتی ہیں البتہ ان کے یہاں مناظر اور مکالمہ کا فقدان پایا جاتا ہے۔

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

۵۔ مثنوی 'خواب وخیال' میں ہجر ووصال، راز ونیاز اور عشق ومحبت کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'خواب وخیال' کے متعلق مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ ''شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت وشیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی 'خواب وخیال' کا مقابلہ کرسکتی ہے''۔ اس مثنوی کی سادگی اور لطافت قابل تعریف ہے جب کہ مرقع نگاری میں میر اثر اپنے تمام پیش روؤں کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ مثنوی اہل نقد کی نظر میں زبان وبیان کے لحاظ سے سحرالبیان کے بعد بے مثال قرار دی گئی ہے۔ اس مثنوی میں کسی ایک قصہ پر پلاٹ نہیں گٹھا گیا ہے بلکہ یہ کئی قصوں کا مجموعہ ہے جس میں اخلاق پر بحث کی گئی ہے۔ قاری کو اس میں پچاس سے زیادہ واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس مثنوی کی ایک اہم خوبی اس کا سراپا ہے جو تقریباً سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی زبان صاف ستھری اور رواں دواں ہے۔ محاورات کے مناسب استعمال نے اس مثنوی میں چار چاند لگا دیا ہے۔ اس مثنوی میں عشقیہ جذبات کو بھی خوب صورت طریقے سے ابھارا گیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس مثنوی کی سب سے بڑی خامی قصہ کا بے ربط پن ہے جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کو زبردستی پرویا گیا ہے۔

12.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معنی)
خستہ حالی	مفلسی، ناداری، تنگ دستی
محاکات	کسی چیز یا حالت کی نقل کرنا
محاکمہ	انصاف طلبی، دعوے فیصلہ
ثمر	پھل
فریفتہ	عاشق، دل دادہ
عروسہ	دلہن
مہر تاباں	روشن سورج
شعبدہ بازی	نظر بندی، جادوگری، عیاری، چالاکی
نرگسی	نرگس سے مشابہ
برجوں	برج کی جمع، ستارے کا مقام

لٹوں	لٹ کی جمع، بالوں کی لڑی، جٹا
حزنیہ	دردناک، المیہ
پیش رووٗں	آگے گزرنے والے، آگے آگے چلنے والے
تربت	قبر، مزار
لوح	قبر کے سرہانے کا پتھر یا سل، لکھنے کی تختی
سہاگن	وہ عورت جس کا خاوند زندہ ہو

12.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اردو مثنوی کا ارتقا : عبدالقادر سروری

۲۔ اردو کی تین مثنویاں : خان رشید

۳۔ شمالی ہند کی مثنویاں : گیان چند جین

۴۔ تاریخ ادب اردو : وہاب اشرفی

۵۔ تاریخ ادب اردو : رام بابو سکسینہ

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY